قوموں کی اصلاح نوجوانوں کی اصلاح کے بغیر نہیں ہو سکتی

ماہنامہ "خالد" ربوہ

یاتون من کل فج عمیق

حضرت خلیفۃ المسیح الثالث ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز جلسہ سالانہ 1976 میں خطاب فرما رہے ہیں

تبلیغ 1355 ہش
فروری 1976ء

* ایڈیٹر *
نسیم مہدی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ
اِسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ

"تیری عاجزانہ راہیں اُس کو پسند آئیں"۔ (الہام حضرت مسیح موعودؑ)

"قوموں کی اصلاح نوجوانوں کی اصلاح کے بغیر نہیں ہو سکتی" (المصلح الموعودؓ)

مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ کا ترجمان

ماہنامہ

خالد

جلد: ۲۲
نمبر: ۴
ربوہ

فروری ۱۹۷۶ء
تبلیغ ۱۳۵۵ ہش

• ایڈیٹر:۔ نسیم مہدی
• نائبین:۔ طارق محمود طارق ـ حافظ مظفر احمد
• ترتیب و تزئین:۔ مغفور احمد منیب

الفہرس

● اس دفعہ جلسہ سالانہ پر غیر ملکی بھائیوں کی خدمت کرنے کی توفیق ملی۔ اس موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مختلف دوستوں سے ان کے تاثرات اکٹھے کئے گئے۔ میں ممنون ہوں کہ محترم واجب الاحترام بزرگ مکرم چوہدری محمد خان صاحب نے ٹیپ ریکارڈر سے ان انٹرویوز کو صفحہ قرطاس پر منتقل کیا اور اردو کا جامہ پہنایا۔ فجزاہ اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔ اس شمارہ میں ہم خصوصی اشاعت کے طور پر آٹھ امریکن بھائیوں کے تاثرات ہدیہ قارئین کر رہے ہیں۔ اسی مناسبت سے جناب سید سجاد احمد کا اثر انگیز مضمون بھی شامل اشاعت کیا جا رہا ہے۔

☆

● علامہ اقبال اور جماعت احمدیہ ------ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ جناب شیخ عبد القادر اسی سلسلہ کی ایک کڑی سے پردہ اٹھاتے ہیں۔

☆

● جنگ عظیم کی دلچسپ کہانیوں کے تراجم کا ایک نیا سلسلہ ہم اسی شمارہ سے شروع کر رہے ہیں امید ہے قارئین اسے پسند کریں گے۔ اس شمارہ میں "آخری مہم" پڑھ کر آپ جناب ثناء احمد ناز کو ضرور داد دیں گے۔ جنہوں نے عجیب و دلچسپ روداد کو "اُردوانے" کی کامیاب کوشش کی ہے۔

☆

● جناب ڈاکٹر سید محمد پرواڈی کے سفرنامہ کی پہلی قسط آپ جلسہ سالانہ نمبر میں ملاحظہ کر چکے ہیں۔ اب اس کا دوسرا حصہ ملاحظہ فرمائیے اور اس بارہ میں اپنی رائے سے مطلع کیجئے!

☆

● ہمیں بے حد خوشی ہے کہ خالد کا معیار اب محض اللہ تعالیٰ کے فضل اور قارئین کے تعاون سے کافی بلند ہو چکا ہے۔ ہماری ہر دم یہی خواہش ہے کہ ہمارے عزیز بھائی تنقیدی نگاہ سے پرچہ کا جائزہ لیتے رہا کریں اور اپنی قیمتی آراء سے ہمیں مطلع کرتے رہا کریں ------- قارئین کرام سے التماس ہے کہ پرچہ زیادہ سے زیادہ لوگوں میں متعارف کروائیں۔ خریداری میں اضافہ فرمائیں اور اپنی مساعی سے مطلع فرمائیں!

[illegible]
۲۰ فروری

☆

ماہنامہ خالد کی اشاعتِ خصوصی

پانچ خوش قسمت

مجلّسِ حقیق

جلسہ سالانہ ۱۹۷۵ء کے موقع پر تشریف لانے والے غیر ملکی بھائیوں میں سے چند ایک کے

تاثرات

سوالات یہ تھے :۔

- آپ کا نام، شہر اور مُلک ؟
- کیا آپ ربوہ میں پہلی بار آئے ہیں ؟
- آپ نے اسلام و احمدیت کب قبول کی ؟
- براہِ کرم ربوہ اور جلسہ سالانہ سے متعلق اپنے تاثرات بتائیں !
- جلسہ کے دوران اور اس کے بعد آپ کو کس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا ؟
- آپ نے ربوہ کے مکین کیسے پائے ؟
- "ربوہ شہر" کے بارہ میں آپ کی کیا رائے ہے ؟
- جلسہ سالانہ کے وسیع انتظامات کے متعلق آپ کا کیا تبصرہ ہے ؟
- کیا آپکو اپنے قیام کے دوران کسی قسم کی تکلیف یا مشکل کا سامنا کرنا پڑا ؟ وہ مشکل کیا تھی ؟
- کیا آپکو پاکستانی کھانے پسند آئے ؟ ——— اور کون سا کھانا سب سے زیادہ ؟
- اُن کارکنان کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے جنہوں نے آپ کی خدمت کی ؟
- دورۂ قادیان کے متعلق آپ ہمیں کیا بتانا پسند کریں گے ؟
- کوئی اور بات جو آپ کہنا پسند فرمائیں !

جناب پرنسپل محمد خان عارف نائب رئیس التحریر

جناب مظفر احمد ظفر (امیر وفد امریکہ)

مظفر احمد صاحب ظفر جو امریکن وفد کے قائد اور اپنی بیگم کے ہمراہ تشریف لائے تھے۔ انہوں نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ——— مَیں تیسری مرتبہ جلسہ سالانہ پر حاضر ہوا ہوں۔ ۱۹۵۳ء میں احمدیت کے ساتھ میرا تعارف ہوا اور تین سال تک تحقیق کرنے کے بعد الحمدللہ ۱۹۵۶ء میں جماعت کے ساتھ منسلک ہو گیا۔ مَیں جب بھی ربوہ حاضر ہوا ہر بار پہلے سے زیادہ گہرا اثر لے کر واپس گیا۔ جلسہ سالانہ کے انتظامات کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا ——— مادی وسائل کے لحاظ سے اس سے بہتر انتظامات نہیں ہو سکتے۔ روحانی لحاظ سے یہاں کے لوگوں کا معیار قابلِ رشک ہے اور مَیں جو خیالات عرض کر رہا ہوں بعینہٖ یہی خیالات میری

رفیقۂ حیات کے بھی ہیں۔ یہاں ہر احمدی قربانی اور ایثار کا مجسمہ معلوم ہوتا ہے۔ اخوت، اور بھائی چارہ کے نظارے قدم قدم پر نظر آتے ہیں۔ ہماری خاطر مدارات اور ہمارے ساتھ حسن سلوک میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا۔ ہر ملنے والے نے مجھے متاثر کیا ہے میں واپس جا کر پوری کوشش کروں گا کہ ہمارا ہر امریکن بھائی اپنے پاکستانی احمدی بھائیوں کے دوش بدوش اسلام اور احمدیت کی نمایاں خدمات بجا لانے والا ہو۔ جس چیز سے میں بہت زیادہ متاثر ہوا وہ یہاں کے لوگوں کی بے لوث محبت ہے پھر مجھے اپنے امام کی اقتداء میں نمازیں ادا کرنے کی سعادت ملی۔ مجھ پر اس کا بھی شدید اثر ہے۔ اللہ تعالیٰ میری یہ نمازیں قبول فرمائے! ــــــ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ المسلم مرآۃ المسلم۔ یہاں آکر اس کا ذاتی تجربہ ہوا۔ میں نے ہر چہرے میں محبت اور اخوت کا عکس دیکھا۔ اسی قسم کے لوگوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اپنی تجلیات دکھاتا ہے۔ یہاں اس بات کا نمایاں اثر ہے نیکی۔ اخوت۔ محبت اور قربانی کا جذبہ واضح طور پر نظر آتا ہے اور یہی احمدیت کی حقانیت کا ثبوت ہے۔

ربوہ کے بارہ میں انہوں نے فرمایا کہ ــــــ نہایت صاف ستھرا اور خوبصورت شہر ہے۔ روحانی لحاظ سے تو اس کی مثال مشکل ہے۔ جلسہ کے انتظامات اپنی مثال آپ تھے۔ سارے جلسہ میں ہمیں کسی قسم کی کوئی دقت یا مشکل پیش نہیں آئی۔ اور ہمارے ساتھ جو سلوک کیا گیا وہ میری توقعات سے بالا تھا۔ کارکنان اور خدام نے میزبانی کا حق ادا کر دیا۔ ہر کارکن خدمت کی بہترین مثال تھا۔ نوجوانوں میں نظم وضبط قابل دید تھا۔ اس دوران مجھے قادیان جانے کا بھی اتفاق ہوا۔ وہاں بھی میں نے جو سکون محسوس کیا اُسے الفاظ میں ادا نہیں کیا جا سکتا۔ صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ وہاں کے لوگوں نے ہمارے ساتھ جس محبت کا مظاہرہ کیا وہ اپنی مثال آپ تھا۔

آپ سے عرض کیا گیا کہ کیا آپ کوئی نصیحت فرمائیں گے؟ ــــــ تو کہا میں تو خود سیکھنے کے لئے آیا ہوں۔ میں صرف یہی نصیحت کروں گا کہ مجھے آپ لوگ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں!

جناب محمد صادق

نیو آرک کے بنگ بھائی محمد صادق صاحب نے جو آج سے ۳۰ سال قبل حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ فرمایا کہ وہ نیو جرسی سٹیٹ کے باشندے ہیں اور ربوہ آنے کا یہ دوسرا موقعہ ہے اور امید ہے کہ یہ آخری موقعہ نہیں ہوگا بلکہ اللہ تعالیٰ مجھے توفیق دے تو میں بار بار یہاں آؤں گا۔

ربوہ سے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ یہ شہر پُرسکون ہے۔ نیویارک میں ہم راتوں کو کب ایسے پھر سکتے ہیں۔ جیسے یہاں چل پھر سکتے ہیں۔ جنت کی تعریف میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہاں کے مکین ہر طرف سے السلام علیکم کہیں گے۔ مجھے یہاں ہر طرف سے "سلام علیکم" ہی کی آوازیں آئیں اور میرا دل سرور سے بھر گیا۔ مجھے یہاں آکر حد درجہ روحانی سکون

اور یہیں میسّر ہوا۔ مجھے تو یہ ساری دنیا میں جنّت معلوم ہوتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ربوہ میں گرد و غبار ہے۔ مجھے تو اس سے بھی عشق ہے۔ ربوہ کے لوگ ایک نرالی مخلوق ہیں۔ دنیا میں ایسے لوگ شاذ ہی نظر آتے ہیں کیونکہ مجھے ایسی محبّت کی مثال اور کہیں نہیں ملی۔ جلسہ کے انتظامات حیران کن تھے۔ مہمان نوازی کے بارہ میں میرا تاثر یہ ہے کہ اس کا کسی بھی جگہ سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہماری رہائش۔ ہمارے کھانے۔ ہمارے آرام کے سب سامان مہیا کئے گئے تھے اور مجھے کوئی دقت پیش نہیں آئی موسم یا پانی کی تبدیلی کا کچھ اثر ہوا لیکن اس کی ذرا فکر نہیں۔ ہر کھانا مجھے پسند آیا۔ بلکہ میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ یہاں آکر میں نے ضرورت سے زیادہ کھا کر اپنا وزن بڑھا لیا۔ قادیان جا کر مجھے وہی محسوس ہوا جو ربوہ میں۔ مجھے مسیح پاکؑ کے گھر کی زیارت نصیب ہوئی۔ وہ گلیاں دیکھیں جہاں آپ چلے اور پھرے۔ قادیان اور ربوہ دونوں مجھے میرے اپنے گھر کی طرح ہی محسوس ہوئے اگرچہ اب ہم یہاں سے چلے جائیں گے لیکن میری یہ دلی تمنّا ہے کہ میں بار بار یہاں آؤں اور یہاں کی روحانی کیفیت سے لطف اندوز ہوں۔"

جناب عُمر فاروق قذّافی

عمر فاروق قذافی نیویارک میں پیدا ہوئے۔ اب ڈیٹن میں آباد ہیں۔ فرمایا کہ ——— "ماشاءاللہ! میں پہلی بار ربوہ حاضر ہوا ہوں۔ ۲۲ فروری ۱۹۷۴ء میں اسلام قبول کیا۔ قبولیت اسلام سے چھ ماہ قبل میں مطالعہ کرتا رہا۔ جب یقین ہو گیا تو بیعت کی۔ امریکہ میں میں یہ تجربہ کر چکا ہوں کہ احمدیت ہی حقیقی اسلام ہے لیکن ربوہ آکر اس کا ذاتی مشاہدہ بھی کر لیا۔ میں جب جلسہ سالانہ کے لئے ڈیٹن سے نیویارک موٹر میں آیا۔ اور نیویارک سے کراچی اور پھر لاہور پہنچا اور وہاں سے بھر بس میں ربوہ پہنچا تو چند گھنٹوں کے اندر یہ محسوس کر لیا کہ اسلام صحیح معنوں میں یہاں ہے نہ صرف اسلام کے لئے ان لوگوں میں محبّت ہے بلکہ یہ لوگ سچّی انسانیت سے محبّت کرنے والے ہیں۔ اور میں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور محسوس کیا۔ یہاں کے لوگوں میں جس جس سے ملا۔ انہوں نے میری پوری عزّت اور احترام کیا۔ مجھے گلے سے لگایا حالانکہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی عزّت مجھ پر واجب ہے۔ مجھے یہ لوگ ایسا سمجھتے ہیں گویا میں ان کا وہ گمشدہ بھائی ہوں جو عرصہ کے بعد انہیں ملا ہے۔ لوگ مجھے دعاؤں کے لئے کہتے ہیں۔ حالانکہ ابھی سال بھر ہی تو ہوا ہے کہ میں نے احمدیت قبول کی ہے۔ یہ کس قدر عجیب معلوم ہوتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ میں ان سب کی دعاؤں کا محتاج ہوں۔

اس سوال کے جواب میں کہ آپ کو کس چیز نے متاثر کیا؟ جناب عمر فاروق قذافی نے فرمایا کہ ——— علم و فضل کا انتشار جو ان دنوں فضا میں ہو رہا تھا اس سے میں بہت متاثر ہوا۔ سادہ لوگ۔ غریب لوگ۔ امیر لوگ سب بیٹھے علم و عرفان کی باتیں۔ خلیفۃ المسیح ایدہ اللہ کی تقریریں ہمہ تن گوش ہو کر سن رہے تھے یہ وہ نعمت ہے جو بادشاہوں اور بڑے بڑے باجبروت لوگوں کو بھی نہیں مل سکتی۔ پھر جلسہ کے بعد ربوہ جس میں انسانوں کا بحر ذخار ٹھاٹھیں مارتا رہا۔ فوراً

پچھ اپنے محل پہ آ گیا۔ صفائی ہو گئی اور اتنی جلدی کہ میں حیران ہوں کہ یہ سب کچھ کیسے کر لیا گیا۔ خدام اور کارکنان میں جذبہ بہت کام کو دیکھ کر یہ واقعی اثر انگیز تھا۔ میں امریکہ سے آیا ہوں۔ میں وہیں پیدا ہوا۔ پلا، بڑھا اور جوان ہوا۔ وہاں کی عیسائی سوسائٹی جو اخوت سے نا آشنا ہے۔ وہاں یہ یقین ہی نہیں آتا کہ لوگ اتنی محبت سے پیش آ سکتے ہیں۔ ہم سب کے لئے یہ تجربہ واقعی ناقابلِ یقین تھا۔ جو بھی مجھے ملا گلے لگایا۔ بہت سے لوگ نام پوچھتے تھے۔ حال پوچھتے تھے۔ میں کہاں سے آیا ہوں۔ ان کے چہروں سے محبت پھوٹ پڑتی تھی۔ یہ چیز اتنی محبت امریکہ میں کہاں؟ مجھے اس قدر عزت و احترام سے دیکھا گیا گویا میں کوئی بڑی اہم شخصیت ہوں حالانکہ میں تو ان جیسا ان کا بھائی ہوں۔ یہ بھی مختصر ہوں۔ اس سب نے مجھے احمدی ہونے کے ناطے سے پیار اور محبت سے لگایا۔

انتظامات کا میرے دل پر گہرا اثر ہے۔ ہزاروں لوگوں کے کھانے اور رہائش کا انتظام اور اتنا اچھا کہ ناقابلِ یقین معلوم ہوتا ہے۔ ٹریفک کا انتظام، روشنی کا انتظام، مردوں کا علیحدہ عورتوں کا علیحدہ۔ کھانے کا انتظام سب سے اعلیٰ تھا۔ کہیں کوئی لڑائی یا جھگڑا نام کو بھی نظر نہ آیا۔ ہر شخص مطمئن نظر آتا تھا۔ امریکہ میں یہ چیز کہاں؟ امریکہ تو شیطنت سے چل رہا ہے۔ ٹیکنیکی لحاظ سے بہت آگے جا رہا ہے اور یہاں ربوہ میں جہاں امریکہ کی کوئی بھی سہولت موجود نہیں اتنا بڑا انتظام بہت بڑا کارنامہ نہیں تو اور کیا ہے؟

مجھے یہاں کیا مشکل پیش آئی؟ —— اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم امریکہ جیسے آسودہ حال ملک سے آئے ہیں لیکن یہاں آ کر بھی ہمیں اسی قسم کی سہولتیں مل گئیں۔ حالانکہ پاکستان ذرا ROUGH ملک ہے لیکن یہاں بھی ہمیں گرم پانی مل گیا۔ شاور مل گیا۔ بستر مجھے مل گئے۔ ہر چیز ہمیں مہیا کی گئی۔ ہمیں اس سے زیادہ اور کیا چاہئے تھا۔ کھانوں میں مجھے چاول سالن، سبزی غرضیکہ ہر چیز پسند آئی۔ جو کارکنان خدمت پر مامور تھے ان کی خدمت انمول تھی۔ ہمارے یہاں امریکہ میں ہر چیز ڈالروں میں تلتی ہے۔ ہر چیز کی اجرت ہے لیکن یہاں ہر چیز ہر کام میں عبادت کا جذبہ کار فرما تھا۔ میری خدمت یوں کی گئی گویا میں DIPLOMAT ہوں۔ اگر کوئی شخص بے چین تھا تو صرف اس لئے کہ کام جلد اور صحیح کیوں نہیں ہو رہا اور جب کام مکمل ہو جاتا تو عجیب سی مسرت اور سکون کے آثار ان کے چہرے پر نظر آنے لگتے ہیں اور میں انہیں دیکھ کر محوِ حیرت ہو جاتا —— قادیان کی دنیا امریکہ کی اندھی دنیا سے کہیں دور تھی۔ میں نے ایسی دنیا کبھی نہیں دیکھی۔ لاثانی تھی۔ خوبصورت تھی اور ناقابلِ یقین تھی۔ اس کو بیان کرنے کے لئے میرے پاس تو الفاظ بھی نہیں ——!

جناب جلال الدین عبد اللطیف

یہ ہیں —— جلال الدین عبد اللطیف —— نیو جرسی جو نیویارک سے ۲۰ میل دور ہے وہاں رہتے ہیں اور یہ ان کا پہلا دورہ ہے کہنے لگے مجھے امید ہے کہ میرا یہ دورہ آخری نہیں ہوگا اور مجھے آئندہ بھی آنے کی توفیق ملے گی۔ جس سکون، راحت، محبت اور اخوت کے نظارے میں نے یہاں دیکھے، ناقابلِ فراموش ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جلسہ کے انتظامات کے لئے ایک کمیٹی مقرر ہے اور جس مہارت اور تجربات کے ساتھ انتظامات کئے گئے اس سے معلوم ہوتا ہے

کہ کمیٹی کا ہر ممبر اپنے کام میں پورا ماہر ہے۔ سوا لاکھ انسانوں کے کھانے اور رہائش کا انتظام جلسے کی کارروائی یا اذان
کی دیکھ بھال آخر یہ سب کچھ غیر معمولی نہیں تو اور کیا ہے؟ یہاں پر تو دنیا کی وہ سہولتیں بھی موجود نہیں تھیں لیکن اس کے
باوجود ہر چیز آرام اور سکون سے مکمل ہو رہی ہے۔ میرے پاس ان لوگوں کی تعریف کے لئے الفاظ نہیں ہیں جو ان سب کاموں
کو بطریق احسن سرانجام دے رہے ہیں۔

ان سے پوچھا گیا کہ ـــــ آپ کو یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟ تو کہنے لگے ـــــ ہاں ایک تکلیف
تھی اور وہ یہ کہ دن میں گھنٹے کم تھے کاش کہ دن میں ۴۸ گھنٹے ہوا کرتا تو زیادہ وقت ہوتا تاکہ ہم یہاں کی نعمتوں سے
اور زیادہ مالا مال ہو سکتے۔ لوگ مجھ سے ملنا چاہتے تھے۔ مجھے گھر لے جانا چاہتے تھے۔ باتیں کرنا چاہتے تھے۔ کاش کہ دن بڑا
ہو جاتا! ـــــ کھانے آپ کو سب اپنا تھے لیکن کھیر کی پڈنگ آپ نے بہت پسند کی کہنے لگے جب مجھے پتہ چلا
کہ وہ کارکنان جو ان کی خدمت پر مامور ہیں وہ یا تو مبلغین سلسلہ ہیں یا انگلستان سے مبلغ بننے والے ہیں اور یا خاندان مسیح موعود
کے لوگ ہیں تو مجھے بہت SHOCK ہوا کیونکہ وہ لوگ ہیں جن کی مجھے خدمت کرنی چاہیئے نہ کہ وہ میری خدمت کریں لیکن
میں ان کے انتظامات میں دخل نہ دے سکتا تھا۔ ہر شخص منکسر المزاج، محبت کا پیکر اور خدمت کا مجسمہ نظر آیا۔

قادیان وہ بستی ہے جہاں مسیح پاک کا ظہور ہوا۔ یہاں وہ بازار اور گلیاں ہیں جہاں آپ چلتے پھرتے تھے۔ میں نے
اپنی آنکھوں سے وہ بستی دیکھ لی۔ میں وہاں بھی اس کمرے میں سویا جہاں آپ نے جنم لیا۔ میرا تو بہت گہرا تعلق ہے میں
اس کے گھر میں ہوں جو میرا آقا ہے اور میں اس تاثر کو لفظوں میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔

جناب بشیر افضل

یہ SNARK LAND نیوجرسی کے امیر ہیں۔ ان کا نام بشیر افضل ہے۔ ۱۹۳۶ء میں جناب صوفی مطیع الرحمٰن
صاحب بنگالی کے ذریعہ احمدیت قبول کی۔ فرمانے لگے میں نے بہت سے جلسے دیکھے ہیں لیکن یہ پہلا جلسہ
دیکھا اور کوئی انتظام نہیں دیکھا۔ سب سے زیادہ جس واقعہ نے متاثر کیا وہ یہ تھا کہ جلسہ کے تیسرے دن بارش ہو گئی
لیکن جلسہ کی کارروائی میں کوئی رخنہ نہ پڑا۔ ہم ابھی جلسہ گاہ پہنچ گئے۔ میں سائبان میں ایسی جگہ بیٹھا تھا جہاں بارش کے
قطرے میری ٹانگوں پر گرے۔ پہلے تو میں نے وہاں سے اٹھ کر دوسری جگہ جانا چاہا لیکن جب باہر نظر کی تو سب لوگ بارش میں
بڑے سکون سے بیٹھے جلسہ سن رہے تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ یہاں سے نہ اٹھوں گا۔ یہ چند قطرے مجھے کیا نقصان پہنچائیں گے
یہاں کے لوگوں کے بارہ میں آپ نے بتایا کہ بہت ہی محبت کرنے والے ہیں۔ اصل الفاظ ان کے یہ تھے "VERY
VERY WARM" ۔ میں جتنے لوگوں سے ملا سب ایک ہی رنگ میں رنگین ہیں۔ بہر حال میں ان کے لئے دعا کروں گا کہ اللہ تعالیٰ
انہیں آرام اور سکون کی زندگی دے اور ان کی عمریں دراز کرے ـــــ انتظامات کے سلسلہ میں فرمایا ـــــ

کہ میں نے یہ سب دیکھے اور مجھ پر ان کا بہت ہی گہرا اثر ہے۔ میں نے دیکھا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر شخص جانتا ہے کہ اسے کیا کرنا ہے اور گویا کہ یہ اس کا روزمرہ کا کام ہے اور کسی کو بتانا نہیں پڑ رہا تھا کہ تم یہ کرو اور تم وہ کرو۔

ان سے پوچھا گیا کہ ——— "کیا آپ کو کوئی مشکل پیش آئی؟" تو جواب دیا کہ ——— کھانا بہترین۔ رہائش بہترین۔ انتظام بہترین۔ سروس بہترین ——— مجھے اور کیا چاہیئے تھا۔ کھانوں میں آپ نے کسٹرڈ اور جلیبی پسند کی۔ ایک چیز جس کا نام انہیں نہیں آتا تھا تو فرمانے لگے کہ دودھ میں چاول اور گاجریں مجھے بہت اچھی لگیں تو انہیں بتایا گیا کہ اسے ہم "گجریلا" کہتے ہیں تو سوچ کر اس کا نام یاد کر لیا۔ کام کرنے والوں کے بارے میں اور بھی باتیں کہیں جو دوسرے بھائیوں نے اوپر بیان کی ہیں لیکن یہ بھی کہا کہ ہر کارکن مسکراہٹ سے کام کر رہا تھا۔ بااخلاق تھا۔ عاجز اور منکسر المزاج تھا اور اس بات پر فخر محسوس کرتا تھا کہ وہ ہماری خدمت کر رہا ہے۔

قادیان کے بارہ میں کہا کہ ——— یہ تو میرا پرانا خواب تھا۔ میں اس کی اکثر خواہش کیا کرتا تھا جو آج پوری ہوئی۔ میں نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کتب پڑھی ہیں آپ نے جماعت کی ترقی کے لئے جو پیشگوئیاں کی ہیں وہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ میں نے قادیان دیکھ کر محسوس کیا کہ میں تو ہزاروں میل دور رہتا ہوں اور یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے قادیان دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ میں اُن گلیوں میں پھرا جہاں حضرت مسیح موعودؑ پھرے۔ میں نے ان کمروں میں دو راتیں گذاریں جہاں میرا آقا رہا کرتا تھا۔ میں نے اس کا مقدس مقبرہ دیکھا جہاں وہ محو استراحت ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے جو اس نے مجھے یہ موقعہ بخشا اور میں اسے زندگی بھر کبھی نہ بھولوں گا اور میں نے وہ دوات بھی دیکھی جس میں حضورؑ نے قلم ڈبو کر معرکۃ الآراء کتب لکھیں۔ میں نے حضورؑ کے لباس کا ایک ٹکڑا دیکھا اور اسے سونگھا اور وہ خوشبو محسوس کی جو انسان نے ابھی تک ایجاد نہیں کی۔

آپ سے پوچھا گیا کہ "کوئی خاص بات جو آپ نے نوٹ کی ہو؟" تو فرمانے لگے کہ ——— ربوہ کی یہ سرزمین بنجر تھی۔ مردہ تھی۔ نہ کوئی یہاں رہنا چاہتا تھا نہ رہ سکتا تھا۔ یہاں اتنا بڑا شہر آباد کر دینا واقعی عظیم کارنامہ ہے۔ میں یہاں کی عمارتوں کو دیکھتا ہوں۔ سڑکوں کی دیواریں دیکھتا ہوں۔ نہ کوئی کرین ہے نہ بلڈوزر۔ مجھے تو کوئی بڑی مشین بھی نظر نہیں آتی لیکن یہ سب ان کے بغیر بن گیا اور یہی معجزہ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ علیم و خبیر ہے وہی اپنے راز جانتا ہے اور یہ اسی کی مرضی تھی کہ یہاں پر یہ شہر آباد ہو اور اس نے اپنی صفت خالقیت کا اظہار فرمایا ہے اور اسی زمین اور خاک سے ایسی ایسی چیزیں پیدا کر دیں اور میں اس سے بہت متاثر ہوا ہوں اور مجھے اب یقین ہو گیا ہے احمدیت ہی حقیقی اسلام اور سچا دین ہے ———

جناب بشیر افضل نے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ ہمارے خلیفہ کو عمر دراز عطا فرمائے اور ہم جب امریکہ جائیں تو اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم اس گناہوں کی سرزمین کو بھی نیکیوں اور روحانی زندگی کی

کی طرف بلانے میں کامیاب ہو سکیں ۔"

جناب امین اللہ عاقو

امین اللہ صاحب عاقو نے بھراتے ہوئے لہجہ میں اپنا انٹرویو ان دو فقروں میں ہی ختم کر دیا کہ ــــــ "میرے بھائیوں نے جو کچھ کہا ہے وہ میرے ہی جذبات کی ترجمانی ہے میرے پاس اس سے زیادہ الفاظ نہیں ۔"

جناب محمد عیسیٰ ابراہیم

محمد عیسیٰ ابراہیم ROWAY نیو جرسی کے رہنے والے ہیں ۔ ان کا یہ پہلا دورہ ہے اور آپ نے ۲۰ اپریل ۱۹۷۵ء کو اسلام قبول کیا ۔ ہمارے سوالوں کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ لاہور میں مجھے ایک دوست نے بتایا کہ ربوہ کوئی بہت بڑا اور شان و شوکت والا تاریخی نوادر والا شہر نہیں ۔ یہ تو دلوں میں بسنے والی بستی ہے اور میں اسی تاثر کے ساتھ یہاں آیا تو دیکھا کہ واقعی یہ شہر لوگوں کے دلوں میں بستا ہے اور میں نے بھی اسے اپنے دل میں بسا لیا ۔ میرے دل میں احمدیوں کے اس عظیم اجتماع نے بہت اثر کیا ہے اگرچہ مجھے یہاں کی تقریروں کی زبان سمجھ نہیں آتی تھی لیکن مجھے وہ PUSH مل گیا جس کی مجھے ضرورت تھی تلاش تھی اور یہ ربوہ کے لوگ ۔ یہ تو ہیرے اور جواہرات ہیں ۔ میں ان کی تعریف میں اپنے تاثرات الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں ۔ انتظامات شاندار تھے ۔ مجھے یہاں کسی قسم کی کوئی مشکل پیش نہیں آئی ۔ بیٹھنے کے انتظامات ، رہائش کے انتظامات کھانا وغیرہ ہر چیز نہایت اعلیٰ تھی اور مجھے تو اس عظیم اجتماع کو دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی خاص تقدیر سے یہ سارے انتظامات کرتا چلا جا رہا ہے اور یہ سب لوگ اللہ تعالیٰ کے ہی خادم ہیں ۔

کھانوں میں مجھے پلاؤ اور سوئیاں بہت پسند آئیں ۔ کام کرنے والوں کے بارے میں کہا کہ میں تو انہیں اپنے حقیقی بھائی سمجھتا ہوں ۔ مجھے شدت سے یہ احساس ہے کہ میں نے ضرورت سے بہت زیادہ انہیں تکلیف دی ۔ قادیان جب ہم پہنچے تو مجھے ایسا محسوس ہوا گویا روحانیت کا سیلاب ہے جس میں میں بہتا چلا جا رہا ہوں ۔ سکون اور چین ساری فضا میں محسوس ہو رہا تھا ۔ اور مجھے آئندہ اگر کبھی اپنی رخصتیں گزارنے کا موقعہ ملا تو یہیں گزاروں گا ۔"

جناب عبد الکریم نمائندہ خصوصی مجلس خدام الاحمدیہ امریکہ

عبد الکریم صاحب شکاگو کے رہنے والے ہیں اور آپ نے جولائی ۱۹۶۶ء میں اسلام قبول کیا ۔ اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ــــــ ربوہ بڑا پر سکون شہر ہے ۔ زندگی بڑی سادہ ہے اور جلسہ سالانہ کے بارہ میں جو میرے خیالات تھے ویسا ہی ہوا ۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کا نظارہ شاید دنیا میں اور کہیں نظر نہیں آ سکتا ۔ یہاں کے

لوگوں کے متعلق فرمایا کہ ــــــ سب کے سب بہت محبت کرنے والے۔ بھائیوں کی طرح اور بالکل دوست محسوس ہوئے انتظامات میں مجھے کوئی نقص نظر نہیں آیا۔ آدمی بھی تھے عورتیں بھی تھیں۔ کھانے کے انتظامات اعلیٰ تھے اور یہ انتظامات بالکل ہمارے حالات کے مطابق کئے گئے ہیں۔ ہماری رہائش کے لئے ہر وہ سہولت مہیا کی گئی تھی جس کے ہم عادی تھے۔ اس قسم کی مہمان نوازی کہاں نظر آتی ہے؟

مجھے چونکہ مرچ کھانے کی عادت نہیں اس لئے بعض کھانوں میں مجھے اس بارہ میں کچھ دقت پیش آئی۔ اور کھانوں میں چپاتی مجھے سب سے زیادہ پسند آئی ــــــ قادیان جا کر مجھے یوں محسوس ہوا گویا کہ میں حضرت مسیح موعودؑ کے نقشِ قدم پر چل رہا ہوں۔ میں نے وہ جگہ دیکھی جہاں حضورؑ پیدا ہوئے۔ مسجد کے وہ ستون دیکھے جو حضورؑ نے بنوائے۔ وہ ڈھاب دیکھی اور وہ پل دیکھا جس پر سے گزر کر حضورؑ سیر کے لئے تشریف لے جاتے۔ اور یہ سارا ہی میرے لئے عجیب تجربہ تھا۔

ربوہ کے بارہ میں مزید فرمایا کہ ــــــ یہ رہنے کے لئے بہترین جگہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میں یہاں رہوں لیکن یہاں میرا قیام زیادہ مفید نہیں۔ ہمارا مقصد اشاعتِ دین ہے۔ جی یہی چاہتا ہے کہ جہاں ہمارا خلیفہ ہو ہم بھی وہاں رہیں لیکن ہمیں اپنا مقصد مدِّنظر ہے اور یہ اشاعتِ دین ہے اور اب ہمارا مصمّم ارادہ ہے کہ واپس جا کر پورے زور سے تبلیغِ اسلام میں مصروف ہو جائیں گے۔ ربوہ کی سیر کے لئے میں نے سائیکل حاصل کی اور اگر میں سائیکل نہ لیتا تو میں سارا شہر نہ دیکھ سکتا۔ کل ہم ربوہ کے آخری کنارے پر گئے۔ جب ہم آخری گھر کے پاس پہنچے تو گھر والوں نے ہمیں بلا لیا۔ ہمیں چائے کی دعوت دی۔ امریکہ میں تو ہم یہ تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ وہاں یہ صرف بڑے لوگوں کو ہی میسّر ہے۔ میں تو بڑا آدمی نہیں تھا لیکن یہاں مجھے واقعی اس طرح دعوت دی گئی گویا میں بڑا آدمی ہوں۔

جناب عبدالکریم نے بتایا کہ ــــــ میں شکاگو میں خدام الاحمدیہ کا زعیم ہوں وہاں ہمارے قریباً ۱۳ خدام ہیں۔ ہر بدھ کو میٹنگ ہوتی ہے۔ مطالعہ کے سیشن ہوتے ہیں۔ تبلیغ کے لئے ہم پمفلٹ تقسیم کرتے ہیں اور اس کا بہت اثر ہوتا ہے۔ بعض ادارے ہمیں بلاتے ہیں اور بعض اداروں کے اراکین ہماری مسجد میں آتے ہیں اور یہ بھی تبلیغ کا ایک ذریعہ ہے۔ ہم اپنی کلاسوں میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی کتب کا درس دیتے ہیں۔ ایک دوست "یسرنا القرآن" پڑھاتے ہیں۔ اکثر دوستوں کو قرآن مجید آتا ہے اور کچھ کو زبانی بھی بعض حصے یاد ہیں اور وہ سورتیں جو نماز میں پڑھی جاتی ہیں وہ تو قریباً سب کو آتی ہیں۔

ہم نے ان سے قرآن سننے کی درخواست کی تو انہوں نے سورۃ البقرہ کی پہلی چند آیات اور سورۃ اخلاص سنائی۔ اور کہا کہ ــــــ یہ سب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی برکت ہے کہ ہمیں اسلام جیسی نعمت ملی اور ہم آپ لوگوں کے ممنونِ احسان ہیں کہ آپ کے ذریعہ ہمیں یہ مقدس پیغام پہنچا اور خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ ــــــ ہمیں دینِ حق پہچاننے کی توفیق ملی ــــــ"

(آئندہ شمارہ میں بعض اور دوستوں کے تاثرات ہدیۂ قارئین کئے جائیں گے انشاء اللہ العزیز)

خصوصی اشاعت کا دوسرا مضمون

بینا ہے اگر آنکھ تو قدرت کا نشاں دیکھ

سید سجاد احمد

انسان کو دورِ برق و شرر میں زندگی بسر کرنا بڑی ہمت کا کام ہے اور خصوصاً ایک ایسے انسان کے لئے جو قَالَ اللّٰہ وَ قَالَ الرَّسُوْل پر عامل ہونے کا ساعی ہو اور اس کی یہ سعی عند اللہ مشکور بھی ہو۔ —— ایک ایسا انسان جو محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لئے کوشاں ہو اور جس کی زندگی کا ہر لمحہ اپنے خالق و مالک کی اطاعت میں بسر ہوا ہو۔ لاریب قابلِ صد ستائش اور اللہ تعالیٰ کا محبوب کہلانے کا مستحق ہے وہ انسان جس نے دنیا والوں کی خشمگیں نگاہوں اور علی الاعلان مخالفت کے باوجود اللہ تعالیٰ کا دامن نہ چھوڑنے کا عزم صمیم کر رکھا ہو۔ ناساعد حالات مصائب و آلام اور تند و تیز بگولوں کے باوصف وہ اپنا چراغ جلائے چلا جا رہا ہو اور اس پر مصر ہو کہ انشاء اللہ و بتوفیقہ یہ چراغ جلتا چلا جائے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت اور اس کی رضا اس کے شاملِ حال ہے میں سمجھتا ہوں بلکہ میں کیا ہر صاحبِ حال یہ سمجھ سکتا ہے کہ ایسا انسان انجام کار کامران و کامیاب اور سرخرو ہوگا۔ کیونکہ تاریخ کے صفحات نے ابتدائے آفرینش سے اسی قسم کے ان گنت مناظر و واقعات محفوظ کر رکھے ہیں کہ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کا نعرہ بلند کرنے والے پاکباز و پاک طینت انسان ہی بالآخر فائز المرام ہوئے اور خدائے لم یزل کی اسی تجلی کا پرتو ہر ذی ہوش انسان نے ہر دور میں بچشم خود ملاحظہ کیا کہ وہ ذاتِ پاک فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ہے اور اس سے زندہ تعلق رکھنے والے انسانوں کے ساتھ اس حیّ و قیوم نے ہمیشہ ہی لطف و کرم کا سلوک فرمایا ہے اور یہ سلوک ایک فرد کے ساتھ ہی مختص نہیں ہے بلکہ اگر ان صفات سے متصف انسان بہت سے ہوں اور ایک ہاتھ کے نیچے جمع ہو کر اللہ تعالیٰ کی رضا کے جویا اور دامے درمے قدمے سخنے احکام الٰہی پر سرِ تسلیم خم کرنے والے ہوں۔ تو یہ منظر اور بھی جذب و کیف کا حامل ہو جاتا ہے اور رحمت خداوندی تواتر کے ساتھ ایسے اصحاب الصفہ کی معین و مددگار ہو جاتی ہے۔ گزرے زمانوں میں ایسا

ہوتا رہا ہے اور موجودہ دور میں بھی اس کی امثلہ موجود ہیں
پچھلے دنوں جماعت احمدیہ کا تراسی واں (۸۳) سالانہ
جلسہ ان مثالوں میں سے ایک کہا جا سکتا ہے۔ یہ اجتماع جو
خالصۃً تائیدِ حق اور اعلائے کلمۂ اسلام کی بنیاد پر آج سے
قریباً ایک صدی قبل شروع کیا گیا تھا اور جس کے متعلق بانیٔ
سلسلہ عالیہ احمدیہ حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی
مسیح موعود و مہدی معہود علیہ السلام نے فرمایا تھا:۔

"اس جلسہ کو معمولی جلسوں کی طرح
خیال نہ کریں یہ وہ امر ہے جس کی خالص
تائیدِ حق اور اعلائے کلمۂ اسلام پر
بنیاد ہے اس سلسلہ کی بنیادی اینٹ
خدا تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے رکھی ہے
اور اس کے لیے قومیں تیار کی ہیں۔ جو
عنقریب اس میں آملیں گی۔ کیونکہ یہ
اس قادر کا فعل ہے جس کے آگے
کوئی بات انہونی نہیں۔"

(اشتہار ۷؍ دسمبر ۱۸۹۲ء)

۱۸۹۲ء سے لے کر ۱۹۷۵ء تک پورے تراسی (۸۳)
سال گزر گئے اور بفضلہٖ تعالیٰ یہ بابرکت و مقدس اجتماع
باوجود تندئ بادِ مخالف کے تواتر کے ساتھ ہر سال اپنے
مقررہ دنوں میں وقوع پذیر ہوتا چلا آرہا ہے۔ کم نظروں
کو ہر سال یہ فکر دامنگیر ہو جاتا ہے کہ اب کے وہ نہیں ہوگا
جو پہلے ہوتا آیا ہے اور اس سال شاید تائیدِ حق اور اعلائے
کلمۂ اسلام کا کام اس شد و مد سے نہ ہو سکے۔ لیکن خدائے
یگانہ و برتر پہلے سے زیادہ اپنے افضال و اکرام کے ساتھ
اس جلسہ میں شامل ہونے والوں کا حامی و ناصر ہوتا ہے
اور کیوں نہ ہو جبکہ مسیح پاکؑ نے اس جلسہ کی بنیاد رکھتے
وقت اللہ تعالیٰ کے حکم سے فرمایا تھا۔ (ومن اصدق
من اللہ قولاً)

"ہر ایک صاحب جو اس للّٰہی جلسہ
کے لیے سفر اختیار کریں خدا تعالیٰ
ان کے ساتھ ہو اور ان کو اجر عظیم بخشے
اور ان پر رحم کرے۔ ان کی مشکلات اور
اضطراب کے حالات ان پر آسان کر
دیوے اور ان کے ہم و غم دور فرمائے
اور ان کو ہر تکلیف سے مخلصی عنایت
کرے اور ان کی مرادات کی راہیں ان
پر کھول دیوے اور روزِ آخرت اپنے
ان بندوں کے ساتھ اٹھاوے جن پر
اس کا فضل و رحم ہے اور تا اختتام
سفر ان کے بعد ان کا خلیفہ ہو۔ اے
خدا۔ اے ذوالمجد والعطاء اور رحیم
اور مشکل کشا یہ تمام دعائیں قبول کر
اور ہمیں ہمارے مخالفوں پر روشن
نشانوں کے ساتھ غلبہ عطا فرما کہ ہر ایک
قوت اور طاقت تجھ ہی کو ہے۔ آمین
ثم آمین!"

(اشتہار ۷؍ دسمبر ۱۸۹۲ء)

چشمِ بینا اور دلِ درد مند رکھنے والے لاکھوں
افراد سے ذرا استفسار تو کیجیے۔ وہ دل کی گہرائیوں

سے اس حقیقت کا اعتراف کریں گے کہ انھوں نے قدم قدم پر مسیح پاکؑ کی دل سے نکلی ہوئی ان دعاؤں کے جلوے دیکھے ہیں۔ اور وہ یہ بھی تسلیم کریں گے کہ ہمارا یہ سالانہ اجتماع ایک منفرد حیثیت کا حامل اور اللہ تعالیٰ کی قدرتوں۔ رحمتوں اور اس کے افضال و اکرام کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ وذٰلک فضل اللہ!

گزرنے والے سال کے آخری دنوں میں حسب قدیم ایک بار پھر چشم فلک نے یہ نظارہ دیکھا کہ دنیا بھر کے ممالک سے دیوانے کھنچے چلے آئے۔ کوئی روک ان کے آڑے نہ آئی۔ کسی دیوار نے ان کا راستہ نہ روکا کوئی کانٹا ان سے نہ الجھا۔ کوئی سنگ راہ ان کے عزم کو متزلزل نہ کر سکا۔ جذبے۔ ولولے اور شوق کی فراوانی انھیں کشاں کشاں لیے چلی آئی۔ کسی بھی روک کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے یہ عاشقان باوفا اور پیکر صبر و رضا دلوں میں جذبات کا طوفان لیے اشکبار آنکھوں امنڈتے دلوں اور پرسکون طمانیت سے بھرپور روحوں کے ساتھ پروانہ وار اپنی محبوب بستی میں آن جمع ہوئے۔ ان کا مقصد صرف اور صرف یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا نام بلند کریں ذکر الٰہی کو حرز جان بنائیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی حسین تعلیم کو اپنے دل و دماغ میں مستحضر کر کے اس پر عمل پیرا ہوں اور مہدی علیہ السلام اور ان کے خدام کے ذریعہ دنیا بھر میں اسلام کی سربلندی کے لیے جو مساعی پچھلی ایک صدی سے جاری ہیں ان سے آگاہ ہو کر اپنے ایمان و ایقان کو جلا بخشیں۔ کسی دنیوی غرض اور حرص و آز کی وجہ سے ان زائرین نے دور دراز کا سفر اور تکالیف برداشت نہیں کیں بلکہ محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کی خاطر انہوں نے یہ مبارک سفر اختیار کیا اور دراصل اس جلسہ کی غرض و غایت بھی یہی ہے جیسا کہ مسیح پاکؑ نے فرمایا:۔

"اس جلسہ کی اغراض میں سے بڑی غرض تو یہ ہے کہ تا ہر ایک مخلص کو بالمواجہ دینی فائدہ اٹھانے کا موقع ملے اور ان کی معلومات وسیع ہوں اور خدا تعالیٰ کے فضل و توفیق سے ان کی معرفت ترقی پذیر ہو۔"

(اشتہار ۷ دسمبر)

"........اس جلسہ میں ایسے حقائق و معارف کے سنانے کا شغل رہے گا جو ایمان اور یقین اور معرفت کو ترقی دینے کے لیے ضروری ہیں اور نیز ان دوستوں کے لئے خاص دعائیں اور خاص توجہ ہو گی اور حتی الوسع بدرگاہ رب العالمین کوشش کی جائے گی کہ خدا تعالیٰ ان کو اپنی طرف کھینچے اور اپنے لیے قبول کرے اور پاک تبدیلی ان میں بخشے۔" (آسمانی فیصلہ)

"........میں دوستوں کو نصیحت کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ذکر الٰہی کی عظمت کو اچھی طرح سمجھیں۔ یہاں وہ کسی تماشہ اور کھیل کے لیے جمع نہیں ہوئے بلکہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے اور اس کا

نام لینے کے لیے آتے ہیں۔ اس لیے
ذکرِ الٰہی کے آداب کو مدِنظر رکھنا
چاہیئے۔" (منہاج الطالبین)

چنانچہ اسی مقصد کی خاطر یہ سارا اہتمام کیا گیا۔ اور ۱۵ر دسمبر کے بعد سے ۳۱ر دسمبر بلکہ جنوری کے پہلے ہفتہ تک ربوہ کی بستی اپنے پیار سے اور دلار سے مہمانوں کو جلو میں لیے مسکراتی اور جھومتی رہی۔ اس بستی کے در و بام حمد الٰہی سے گونجتے رہے اور تحمید و تکبیر اور ذکر و فکر کا یہ سلسلہ شب و روز جاری رہا۔ عشقِ الٰہی میں سرشار عباد الرحمان کی سوز و گداز سے معمور دعائیں آستانہ رب العزت تک رسا رہیں۔ اور یہ بستی جذب و کیف میں ڈوبی رہی فخر کرتی رہی کہ مسیح پاک کے وہ مہمان اس میں وارد ہوئے جن کے متعلق یہ دعا کی گئی تھی:۔

"خدا ان کو جزائے خیر بخشے اور ان
کا ہر قدم کا ثواب ان کو عطا فرمائے"
(آسمانی فیصلہ مطبوعہ ۱۸۹۱ء)

"...خدا تعالیٰ مخلصوں کو ہر قدم پر ثواب
دیتا ہے اور اس کی راہ میں کوئی محنت
اور صعوبت ضائع نہیں ہوتی۔"
(اشتہار ۷ر دسمبر ۱۸۹۲ء)

اس سال اس بابرکت جلسہ کی ایک خصوصیت یہ بھی کہ گزشتہ سالوں کی نسبت بہت زیادہ تعداد میں بیرونی ممالک کے وفود اقصائے عالم سے شمولیت کے لیے وارد ہوئے ان میں سے بعض کو بیرون پاکستان کی جماعت ہائے احمدیہ کی نمائندگی کا شرف حاصل ہوا بعض انفرادی طور پر تشریف لائے۔ رنگ و نسل کا حسین امتزاج دیکھنے میں آیا۔ انگریز۔ جرمن۔ امریکن۔ انڈونیشین۔ افریقن سویڈش۔ کینیڈین۔ جزائر کے رہنے والے۔ سری لنکا کے باسی۔ ڈنمارک۔ یوگنڈا۔ ماریشس اور فجی والے۔ بجد شوق و ذوق آئے اور بصد ظرف انہوں نے اپنی پیاس بجھائی۔ رنگ و نسل، تہذیب و تمدن۔ زبان و بیان کے اختلاف کے باوجود ؎

"تیری درگاہ میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے"

کا پُر کیف منظر تھا اور یہ منظر ربوہ کی بستی ہی میں تھا۔ یُوں تو ملکوں ملکوں کے لوگ دنیوی کھیل تماشوں، سینما روں، اقتصادی و سیاسی مجلسوں میں شامل ہوتے ہی ہیں لیکن یہاں جو منظر پیشِ نظر تھا کہ ان مختلف النوع عباد الرحمان کا نقطہ مرکزی حصولِ رضائے الٰہی تھا۔ اور یہ لگن اور تڑپ ان میں جماعت احمدیہ نے ہی پیدا کی۔ اس صادق الوعد خدا تعالیٰ کے فرمان کے مطابق جو آج سے تراسی سال قبل اس نے حضرت مسیح پاک کے منہ سے کہوائے:۔

"اس کے لیئے قومیں تیار کی ہیں۔ جو
عنقریب اس میں آ ملیں گی کیونکہ یہ
اس قادر کا فعل ہے جس کے آگے کوئی
بات انہونی نہیں"
(اشتہار ۷ر دسمبر ۱۸۹۲ء)

اور خدا تعالیٰ کے فضل اور اس کے رحم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہر سال بصد شان پورا ہوتا ہے۔ دعاؤں۔ نمازوں۔ ذکرِ الٰہی۔ تہجد۔ درس قرآن و حدیث۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا بے عدیل منظر ہر لمحہ دلوں کو مسرور و شادماں

کھنچے رکھتا ہے اور حق یہ ہے کہ منزلوں کی مسافت، موسموں کی شدت۔ راستہ کی تکالیف اور چہرہ کی تھکن قصۂ ماضی ہو کر رہ جاتی ہے اور جب یہ والہانہ جذب و شوق کے متوالے لوگ چند دن اس بستی میں بسرام کے بعد اپنے مسکن کی طرف رواں ہوتے ہیں تو دل بے اختیار پکار اٹھتا ہے ع

"بسلامت روی و باز آئی"

یہاں سے لوٹتے وقت ان کے دل مطمئن۔ روحیں سرشار اور چہرے جگمگا رہے ہوتے ہیں کہ انھوں نے مادی دنیا کے اس دور میں اطمینان و مسرت۔ سکونِ قلب و روح کی دولتِ لازوال حاصل کی ہے۔ مسیح الزمان علیہ السلام کی مہمانی کا لطف اٹھایا ہے۔

اہلیانِ ربوہ میں سے کوئی بھی فرد ایسا نہ ہوگا جس نے دل و جان سے آنے والوں کے لیے دیدہ و دل فرشِ راہ نہ کیے ہوں۔ اپنی استطاعت کے مطابق ان کی خدمت نہ کی ہو اور اکرامِ ضیف کا اعلیٰ نمونہ پیش نہ کیا ہو اللہ تعالیٰ ان میزبانوں کا حامی و ناصر ہو اور انہیں اجرِ جزیل عطا فرمائے اور مہمانانِ کرام بھی قابلِ صد مبارک ہیں کہ انھوں نے شرف بخشا اور تکلیف اٹھا کر یہاں تشریف لائے اور ان بابرکت ایام سے استفادہ کیا اور دولتِ عرفان و تسکین سے مالا مال ہوئے۔

اور اب ——— جبکہ ۱۹۷۵ء کا جلسہ سالانہ بخیر و خوبی گزر گیا ہے اور نیا سال نئے عزم و ولولے کے ساتھ ہمارے سامنے ہے اور یہ سال دعوتِ عمل ہے۔ ہم سب کے لیئے۔ اور اللہ تعالیٰ کے شکر اور حمد کا مقام ہے۔ کہ اخوت، محبت، باہمی انسیت اور اصلاحِ نفس کے مزید مواقع ہمیں ملے۔ ہمارا جلسہ اسی محبت و انسیت کا مظہر ہے اور یہ سلسلہ قریباً ایک صدی سے جاری ہے۔ ہمیں اس سلسلہ کو جاری رکھنا ہے۔ خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ اہم فریضہ جماعت احمدیہ کے سپرد کیا ہے۔ اور ؎

اُن کا جو فرض ہے وہ اہلِ سیاست جانیں
اپنا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

اور یہی درسِ محبت و یگانگت سرورِ دو جہاں رحمۃ اللعالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں دیا ہے ؎

"ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم
از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس"

○

15 فروری ہے!

وقارِ عمل کا دن!

(مہتمم وقارِ عمل)

سٹیشنری
چپل ہوائی و نائلون - ہر قسم
سامان منیاری
کی تھوک فروخت کا اعلیٰ مرکز
دیہاتی جنرل سٹور
ریل بازار اوکاڑہ - فون نمبر ۳۷۱۹

آخری قسط

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے

جناب ڈاکٹر پرویز پروازی۔ ایم اے پی ایچ ڈی (اوساکا)

بنکاک سے روانگی

صبح پانچ بجے ہوٹل والوں نے جگایا کہ جہاز سات بجے روانہ ہوتا ہے۔ جلدی کیجئے! ہم تیار کرتے کرتے سوا چھ ہو گئے۔ ہوائی اڈہ ہوٹل سے بہت دور تھا اور اس موٹر میں ہمارے علاوہ دو اور مسافروں کو جانا تھا جو ساڑھے پانچ بجے سے موٹر میں بیٹھے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ خفت اور معذرت کے ساتھ موٹر میں سوار ہوئے۔ اب ڈرائیور صاحب نے ہوا سے شرط باندھی۔ سپیڈو میٹر کی سوئی کبھی سَو کے اس طرف کبھی اس طرف۔ سڑک پر ٹریفک بے شمار۔ دل دھڑکنے لگا۔ خوف کے مارے گھگھی بندھ گئی لیکن بول بھی نہیں سکتے کہ قصور اپنا تھا۔ جلدی تیار ہوئے ہوتے تاکہ وقت پر ہوائی اڈہ پر پہنچتے۔ خدا خدا کر کے ہوائی اڈہ پہنچے تو جان میں جان آئی۔ ٹکٹ چیک ہوا۔ سامان چیک ہوا اور پھر ہم چیک ہوئے۔ وہی سوال کہ کوئی قابلِ اعتراض چیز وغیرہ تو نہیں؟ بس میں بٹھائے گئے اور جہاز میں لا کر سوار کرا دیئے گئے۔ ہمارے سوار ہونے کی دیر تھی کہ جہاز نے اڑنے کے لئے پَر تولے۔ بنکاک سے منیلا تک کا سفر خاصا تکلیف دہ سفر تھا۔ تکلیف دہ اس معنی میں کہ سمندر کے اوپر ہی اوپر پینتیس ہزار فٹ کی بلندی پر اڑتے ہوئے جہاز یک دم دس بارہ ہزار فٹ نیچے غوطہ کھاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے جیسے جھولا آگیا تھا۔ گویا جہاز اڑتا نہیں اچھلتا کودتا ہے ؎

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

فضائی ناشتہ

بنکاک سے جہاز روانہ ہوا تو موسم خاصا خوشگوار تھا دھوپ نکلی ہوئی تھی لیکن ہوا میں نمی تھی۔ جہاز فضا میں پہنچ گیا تو ہم نے حفاظتی بیلٹ کھولی اور اطمینان سے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے۔ ابھی بمشکل دو منٹ گزرے ہوں گے کہ اعلان ہوا حفاظتی بیلٹ باندھ لیجئے۔ کیونکہ موسم خراب ہو گیا ہے اور جہاز کے زیادہ ہچکولے کھانے کا ڈر ہے پھر کر باندھ لی۔ اس دوران ناشتے کی سواری آگئی۔ پوچھا گیا

کیا پئیں گے؟ عرض کیا۔ چائے یا 'کافی'۔ ہوسٹس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ 'بس'؟ ہم نے مسکرا کر کہا۔ "جی ہاں! بس!" وہ شریفہ خاتون یہ سوچتی ہو گی کہ جب وافر مقدار میں بیئر وسکی اور شیمپین مفت مل سکتی ہے۔ یہ عجیب آدمی ہے جو محض چائے اور کافی پہ قناعت کر رہا ہے ؏

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا

ناشتہ بھی غیر شریفانہ حد تک طولانی تھا لیکن ہم نے بھی خوب جی کھول کر دادِ شجاعت دی۔ اس لئے کہ قسطوں میں آنے کی وجہ سے دوسری قسط آتے آتے پہلی قسط کا صفایا ہو جاتا تھا لہٰذا ہوسٹس لاتی چلی گئی اور ہم کھاتے چلے گئے۔ جب فارغ ہوئے تو سامنے خالی پلیٹوں کے کشتوں کے پشتے لگے ہوئے تھے ؎

مے مری توبہ شکن۔ تو یہ مری جام شکن
سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے

ایک دو بار ایسا بھی ہوا کہ ادھر چھری کانٹے سے کسی منہ زور چیز کو رام کر کے منہ میں ڈالنے کے لئے اٹھایا۔ اُدھر جہاز نے دس بارہ ہزار فٹ کا غوطہ لگایا۔ کانٹا ناک پر اور چھری گردن پر آ گئی اور —— "چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی" کا مضمون پیدا ہو گیا۔

"جی ہاں!"

ہمارے کیبن میں ہمارے علاوہ صرف ایک مسافر اور تھا نہایت مسکین اور شریف۔ اس لئے کہ ان کی سوئی "جی ہاں" پر اٹکی ہوئی تھی۔ ہوسٹس نے پوچھا۔ "بیئر لاؤں؟" فرمایا۔ "جی ہاں" —— "یا شیمپین"؟ —— "جی ہاں! "یا وہسکی؟" —— "جی ہاں"! —— ناشتہ میں کیا پسند کریں گے؟" —— "جی ہاں!" —— ہوسٹس نے پریشان ہو کر ادھر اُدھر دیکھا اور پھر نہایت ادب سے سرگوشی میں کوئی سوال کیا۔ بڑے میاں نے تنگ آ کر جواب دیا۔ "جی ہاں ——!"

ہوسٹس واپس ہوئی۔ اس اللہ کی بندی نے سب کچھ حاضر کر دیا اور وہ حضرت قول کے ایسے پکے نکلے کہ سب کچھ صاف کر گئے۔ عوض معاوضہ گلہ ندارد ——

منیلا میں

ناشتہ سے فارغ ہوئے تو جہاز سے باہر جھانک کر دیکھا۔ نیچے گہرا نیلا سمندر تھا اور بادلوں کے غول کے غول تیرتے نظر آ رہے تھے۔ ایک دو بحری جہاز بھی نظر آئے۔ یوں جیسے کھلونے ہوں۔ تھوڑی دیر میں اعلان ہوا کہ ہم فلپائن کے دارالحکومت منیلا میں اترنے والے ہیں۔ اس وقت منیلا میں بارش ہو رہی ہے اور درجہ حرارت ۲۰ ڈگری ہے وغیرہ وغیرہ جزائر فلپائن نگاہ میں تھے۔ چھوٹے چھوٹے اور بہت سے۔ جہاز اوپر سے گزرتا رہا۔ حتیٰ کہ منیلا شروع ہوا —— ایسا شروع ہوا کہ ختم ہونے میں ہی نہ آتا تھا۔ خدا خدا کر کے کہیں جہاز نے نیچے کا رُخ کیا اور زن سے منیلا ائرپورٹ پر اتر گیا۔ دائیں طرف دیکھا تو دو جہاز دوسرے رن وے پر اترنے کے لئے بھاگ رہے تھے۔ وسیع و عریض ائرپورٹ ہے۔ جہاز رکا تو اعلان کیا گیا کہ سب مسافر اتر جائیں اور ایک گھنٹہ کے لئے لاؤنج میں آرام فرمائیں کیونکہ جہاز کی صفائی ہو گی۔ اترے —— ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی لیکن

دھوپ بھی بھرپور نکلی ہوئی تھی۔ لاؤنج میں گئے۔ لاؤنج کیا ہے پورا زبستان ہے۔ سٹال ہی سٹال۔ بھر جی میں آئے خریدیئے! ڈالر میں قیمت ادا کیجئے۔ ڈالر نہیں تو ٹریولر چیک دے دیجئے! بیچنے کہاں چوکنے والے تھے۔ آئس کریم کا سٹال ڈھونڈ نکالا۔ اور آئس کریم اڑائی۔ ایک سٹال سے بیگم نے سنکوں کا بنا ہوا تھیلا خریدا۔ ایک دو مناظر کے کارڈ خریدے یا دھر ادھر پھرے اور ایک گھنٹہ کے بعد واپس جہاز میں!! لیجئے منیلا کی سیر ہو گئی۔ سکور میں ڈالر یعنی دو سو روپیہ۔

امریکی شاطر اور معقول انتظام

منیلا سے بہت سے لوگ سوار ہوئے۔ کیبن بھر گیا بیچے۔ جو پہلے سارے کیبن میں اچھلتے کودتے پھرتے تھے اپنی اپنی سیٹوں میں مقید ہو گئے لیکن مونا باز نہ آسکی۔ کبھی اُس سیٹ کے پاس کبھی اس کے پاس۔ مرے بائیں ہاتھ ایک امریکن بہادر تشریف فرما ہوئے۔ آتے ہی بڑے اہتمام کے ساتھ اپنے بریف کیس سے چھوٹا سا شطرنج کا ڈبہ نکالا اور سلیقہ سے میز پر لگا کر اکیلے ہی کھیلنے لگا۔ کہیں اٹکتے تو فوراً بیگ سے کتاب نکالتے۔ کچھ دیکھتے اور اوندھی سیدھی آوازیں نکالتے ہوئے دوبارہ کھیلنے لگتے۔ کھانے سے ذرا پہلے ہوسٹس نے حسب دستور مشروبات کے بارہ میں پوچھا۔ حضرت نے عینک اتاری اور آنکھیں مٹکاتے ہوئے عجیب سرور کے عالم میں فرمایا "شیمپین ——— !" اس کے بعد شیمپین آتی چلی گئی اور وہ پیتے چلے گئے۔ ادھر گلاس خالی ہوتا ادھر دوبارہ بھر جاتا کچھ دیر تک تو بچے جام گنتے رہے ——— "اب دو ——— اب تین ——— اب چار ——— اب پانچ ——— " بچے گنتے ہوئے تھک گئے۔ وہ پیتے ہوئے نہ تھکے ——— بلانوشی کا مطلب اس روز سمجھ میں آیا عدم یاد آنے لگا۔ ؎

ایک دو ساغروں سے کیا ہوگا
کوئی معقول انتظام کریں

کھانا آیا تو وہ صحیح معنی میں مرد میدان ثابت ہوئے جو آیا۔ جیسا آیا۔ بڑی بلاغت کے ساتھ کھاتے چلے گئے۔ (امریکہ کو شاید اس رعایت سے لوگ کھاتا پیتا ملک کہتے ہیں) کھانے کے دوران بھی شراب چلتی رہی۔ حتیٰ کہ حضرت نیم دراز ہو کر نیم وا آنکھوں سے جام کو محض دیکھنے لگے۔ "ملک نگہ دیدم۔ دم نہ کشیدم"۔ ہوسٹس نے میز سے جام اٹھانا چاہا تو ہاتھ کے اشارے سے روک دیا ؎

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے!

بطخ کا گوشت اور آم

کھانے میں فلپائن کی بطخ کا گوشت بھی تھا اتنا لذیذ گوشت اس سے پہلے کبھی نہ کھایا تھا۔ سنا ہے چینی مرغی کا گوشت بھی مزیدار ہوتا ہے ——— ہوتا ہوگا ——— ہم تو فلپائن کی بطخ کے گرویدہ ہو گئے۔ بچوں کو ہم نے فرمائش کر کے کھلایا۔ پھل آئے۔ دیکھا کہ ٹوکری میں آم بھی رکھا ہے آنکھوں پر یقین نہ آیا تو ہوسٹس سے پوچھا۔ کیا یہ آم ہے؟ فرمانے لگیں۔ "جی ہاں! ہمارے ہاں تو آم ہی کہتے ہیں۔ آپ کے ہاں اسے کیا کہتے ہیں؟" شوق سے اٹھایا۔ کھایا تو بدمزہ سوچا۔ یہ ہوسٹس خراب آم دے گئی ہے۔ دوسرا تازہ منگوایا

چاہیئے۔ دوسرا منگوایا تو وہ بھی ویسا ہی نکلا۔ پوچھا کس ملک کا آم ہے؟ ارشاد ہوا ـــــ فلپائن کا ـــــ سب گلے جا تے رہے ـــــ فلپائن والے تو اسی قسم کے آم کو آم کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو ایسے کو گدھے بھی نہیں کھاتے ہیں۔ غالب یہ آم چکھ لیتے تو مفتی صدر الدین آزردہ سے ناحق آزردہ نہ ہوتے۔

بازیچۂ اطفال

بچوں نے تو جہاز کو بازیچۂ اطفال بنا لیا۔ کبھی یہ اٹھا کبھی وہ چلے چلے کر پھینکتے رہے۔ تلملا تلملا کر ہم انہیں منع کرتے رہے لیکن آفرین ہے ان فضائی میزبان خواتین پر کہ ان کے ماتھے پہ بل نہیں آیا۔ ان کی ہر بات برداشت اور ہر فرمائش پوری کرتی رہیں۔ اسی پر بس نہیں کچھ چھوٹے موٹے تحفے بھی دیئے لیکن آنکھیں بند کر کے مطاہر کو جس کی عمر سات سال ہے مقناطیسی شطرنج عطا فرمائی۔ چھوٹی چھوٹی کاپیاں بھی دیں۔ ایک ننا سا روئی کا بنا ہوا ہاتھی بھی عنایت فرمایا ـــــ ایک کلاسیکی قسم کا لکھنے کا بکس بھی دیا۔ غرض بچے نہال ہو گئے۔

اوساکا میں

اچانک وہ پرانی سہیلی پچھلے کیبن سے تشریف لائیں اور بیگم سے کہنے لگیں۔ اب اوساکا آنے والا ہے مجھے اپنا پتہ لکھوا دیجئے میں کبھی آپ کے ہاں آؤں گی۔ ہم نے کہا بی بی! اوساکا تو جہاز کو ساڑھے چھ بجے پہنچنا ہے اور ابھی صرف پانچ بجے ہیں۔ فرمایا۔ آپ نے بجا فرمایا۔ پاکستان میں یہی وقت ہے لیکن جاپان میں چھ بج چکے ہیں اور آدھے گھنٹے کے بعد آپ اوساکا میں ہوں گے ـــــ کھڑکی سے پردہ ہٹایا تو واقعی شام ہو چکی تھی اور اندھیرا پھیل رہا تھا۔ جلدی جلدی اپنا سامان جو پینے گھری سے ادھر ادھر بکھیر رکھا تھا۔ سمیٹنا شروع کیا۔ بچیوں کے کپڑے بدلوا دیئے۔ خود غسل خانہ میں جا کر نئے بلیڈ سے خوب گھس گھس کر شیو بنائی۔ دو چار بار آئینہ میں اپنی شکل بھی دیکھی اور آئینہ دیکھ کر اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

اوساکا ائیرپورٹ

ہاتھ منہ دھو کر باہر نکلے تو اعلان کیا گیا ہم پندرہ منٹ کے بعد اوساکا انٹرنیشنل ائیرپورٹ پر اترنے والے ہیں۔ کھڑکی سے باہر دیکھا تو روشنیاں ہی روشنیاں نظر آئیں جہاز اوساکا شہر کے اوپر چکر لگا رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد ائیرپورٹ پر اترے۔ بہت سی دعائیں پڑھنے کو جی چاہتا تھا گھبراہٹ میں سب بھول گئیں۔ جہاز سے باہر نکلے تو سرد ہوا کا جھونکا آیا۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ ائیرپورٹ کی عمارت میں داخل ہوئے تو بہت گرم محسوس ہوئی۔ بہت سے مسافر یہاں اترے تھے لہٰذا ہم بھی ان کے پیچھے تیز تیز قدم مارتے ہوئے چلنے لگے۔ ایک برآمدہ ـــــ دوسرا ـــــ تیسرا ـــــ چوتھا۔ خبر نہیں کتنا سفر طے کریں۔ بلکہ ایک جگہ تو مونا کا بوٹ اس کے پاؤں سے گر گیا۔ میں نے جھک کر اٹھایا۔ کچھ دیر ہو گئی تو لوگ بہت آگے نکل گئے۔ بیگم نے جلدی سے کہا۔ جلدی کیجئے اگر یہ لوگ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے تو ہم ان بھول بھلیوں میں لا محالہ بھول جائیں گے۔

خیر صاحب! بھلا ہو جاپان والوں کا۔ بھلے لوگ ہیں ہر کاؤنٹر سے گزر ہم بھی فارغ ہوئے شتابی سے۔

سب سے آخر میں سامان کی چیکنگ کی باری تھی۔ سامان ان کے سامنے رکھا اور کہا ملاحظہ فرمائیے۔ پوچھا ——— "یہاں کیسے آئے ہیں ——— ؟" بتایا کہ ——— "وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے آیا ہوں" ——— "پروفیسر ———!" آپ نے نعرہ مارا ——— "بس سامان کی چیکنگ کی ضرورت نہیں۔ آپ جائیے ———!" ہم نے حیرت سے اس کے منہ کی طرف دیکھا۔ پھر سامان سمیٹا اور بنک میں پہنچ گئے ٹریولر چیک دے کر جاپانی سکہ حاصل کیا۔

"جی آیاں نوں!"

گیٹ سے باہر نکلے تو دو حضرات لپک کر آگے آئے "السلام علیکم! خوش آمدید!! خوش آمدید!!!" یہ میرے رفقائے کار پروفیسر کان کا گایا اور پروفیسر ہماگوچی تھے اسی گرمجوشی۔ محبت اور خلوص کے ساتھ ملے کہ سفر کی ساری کوفت دور ہو گئی۔ ہم نے حسبِ دستور لپک کر معانقہ کرنا چاہا تو ادھر ذرا بھی جنبش نہ ہوئی۔ فوراً خیال آیا کہ جاپان میں معانقہ تو کجا۔ مصافحہ کرنے کا رواج بھی نہیں ہے۔ لیکن لوگ اتنے احترام سے سر جھکا کر سلام کرتے ہیں کہ معانقے اور مصافحے کی کسر پوری ہو جاتی ہے۔

پروفیسر کان کا گایا اور پروفیسر ہماگوچی۔ دونو ہی خلوص کے پتلے نکلے۔ ہمارے ساتھ مصافحہ اور بچوں کو پیار کیا۔ بیگم سے علیک سلیک کی اور بڑے خلوص اور احترام کے ساتھ ہمیں ہماری قیام گاہ تک پہنچایا اور وما علینا الا البلاغ کہہ کر رخصت ہوئے۔ ٥٥

○

بانگِ درا کس نے لکھی ہے؟

ایک انسپکٹر مڈل سکول کے معائنہ کے لئے گئے۔ انہوں نے چھٹی جماعت کے طلبا سے پوچھا ———

"بتاؤ! "بانگِ درا" کس نے لکھی ہے؟"

تمام طلباء خاموش رہے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ انسپکٹر صاحب نے ایک طالب علم کی طرف اشارہ کر کے کہا: "تم بتاؤ!"

"جناب میں نے تو نہیں لکھی!" طالب علم نے جواب دیا۔

انسپکٹر صاحب مسکرائے اور ایک اور طالب علم سے پوچھا "تمہیں معلوم ہے؟"

"جی نہیں جناب! میں نے بھی نہیں لکھی۔"

انہوں نے کئی طلبا سے پوچھا سب نے یہی جواب دیا۔ "میں نے نہیں لکھی۔" اس کے بعد انسپکٹر صاحب نے باری باری ساتویں اور آٹھویں کے طلباء سے بھی یہی سوال کیا۔ مگر انہیں یہی جواب ملا: "میں نے تو نہیں لکھی۔"

انسپکٹر صاحب نے ان جماعتوں کے اساتذہ سے شکایت کی۔ مگر ساتھ ہی پوچھ کہ "کیا آپ جانتے ہیں کہ بانگِ درا کس نے لکھی ہے؟"

ہر استاد نے بھی یہی جواب دیا کہ "میں نے نہیں لکھی۔"

اب تو انسپکٹر صاحب جھنا گئے اور ہیڈ ماسٹر صاحب کو ایک طرف کر کے کہنے لگے: "آپ کے استاد بھی کمال کے ہیں جس سے بھی پوچھا کہ بانگِ درا کس نے لکھی ہے۔ اس نے یہی جواب دیا کہ ——— "جناب میں نے تو نہیں لکھی۔"

ہیڈ ماسٹر صاحب بڑی نازداری سے کہنے لگے۔

"انسپکٹر صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ آپ کے خوف سے وہ نہیں بتلاتے۔ ورنہ ضرور ان میں سے ہی کسی نے لکھی ہے!"

(مرسلہ: خورشید بخاری۔ ربوہ)

جاوید ٹریڈرز
امپورٹرز سپیئر پارٹس برائے مرسڈیز بینز و جیپس
۱۵۴ - کے ایم سی مارکیٹ گارڈن
لارنس روڈ کراچی
فون ۷۵۴۵۰

ہر قسم کی عمارتی لکڑی خریدنے کیلئے
اپنے مشہور ادارہ
سٹار ٹمبر سٹور
۵۳ فیروزپور روڈ۔ اچھرہ۔ لاہور
(نزد معراج بلڈنگ)
کو یاد رکھیں
(فون ۔ ۴۱۰۶۱۷)

سائنس کی دنیا

سید امجد بشیر، انجنیئر انچارج الیکٹرانکس ورکشاپ نیو کیمپس ربوہ
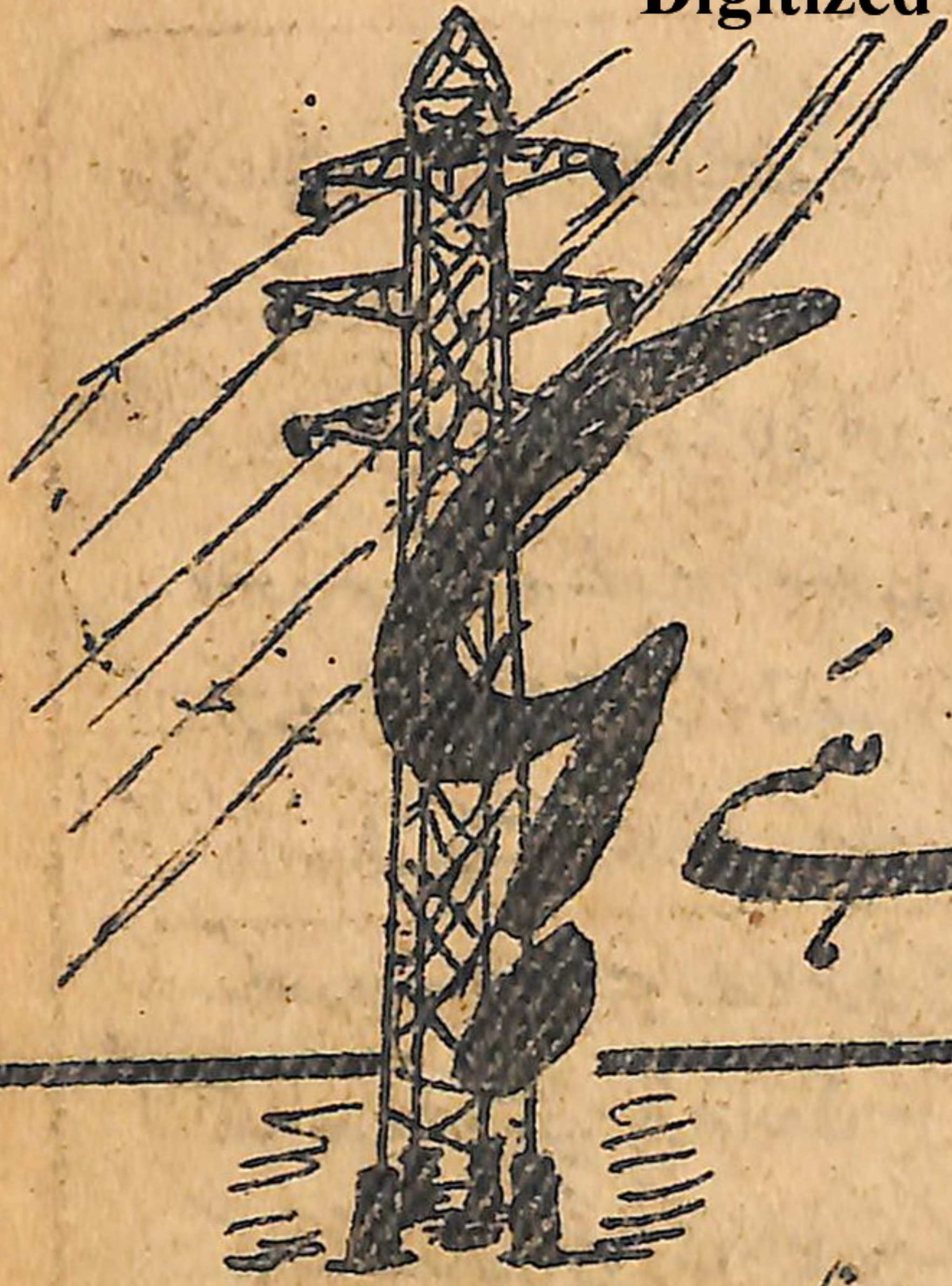
الیکٹرانکس کیا ہے

بیسویں صدی کا ایک **الیکٹرانکس** ایسا جدید علم ہے جس کی مدد سے آج کا انسان اس قابل ہوگیا ہے کہ ناممکن کو ممکن میں بدل دے اور کل کے خواب آج کی حقیقت بنا دے۔ یہ انسان کے ہاتھ میں ایک ایسا طاقتور آلہ ہے۔ جسے ایک طرف اگر وہ اپنی بقا کی جدوجہد میں استعمال کر رہا ہے تو دوسری طرف اسی کے ذریعہ سے اپنی فنا کے سامان بھی تیار کر رہا ہے۔ الیکٹرانکس کا علم اس وقت دوسرے تمام سائنسی علوم وفنون کی جان ہے۔ یہ انسان کا ایک ادنیٰ غلام ہے جو ایک طرف اسے سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں اور دوسری طرف خلا کی بے پناہ وسعتوں تک لے گیا ہے۔

چونکہ آئندہ زمانے میں ان علوم کی طاقت کا صحیح استعمال احمدی نوجوانوں نے ہی انسان کو سکھانا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ کے غضب سے بچنے اور اس کے پیار کو حاصل کرنے کی راہ دکھانی ہے اس لیئے بہت ضروری ہے کہ وہ یہ علوم جاننے کی کوشش کریں۔

الیکٹرانکس اس بنیادی اصول پر قائم ہے کہ کوئی بھی کمزور برقی سگنل طاقتور بنایا جا سکتا ہے اس اصول کی ابتداء گزشتہ زمانے میں الیکٹران ٹیوبوں کے استعمال سے ہوئی جن میں سے گزرنے والی برقی رو کو ٹیوب کی گرڈ پر اطلاق شدہ برقی طاقت کے ذریعہ کنٹرول کیا جا سکتا تھا۔ چونکہ ٹیوب کی ساخت اس قسم کی ہوتی ہے کہ تھوڑی برقی طاقت برقی رو کی بڑی مقدار کو کنٹرول کر سکتی ہے اس لئے اس کے ذریعہ کمزور برقی سگنل طاقتور سگنلوں میں تبدیل کئے جا سکتے ہیں۔ اس کا سب سے پہلا استعمال ایک جگہ سے دوسری جگہ بذریعہ مورس کوڈ بات کرنے کے لیے ہوا۔ مورس کوڈ بھیجنا تو آسان ہے کیونکہ وقفہ وقفہ سے بجلی کے سپارک پیدا کر کے اسے بھیجا جا سکتا ہے۔ مگر وصول کرنا مشکل ہے کیونکہ کچھ دور جا کر برقی لہریں کمزور پڑ جاتی ہیں۔ اگر ایریل میں وصول شدہ سگنل ٹیوب کے ذریعہ طاقتو

بنا لیا جائے تو زیادہ فاصلے تک سگنل وصول کیا جا سکتا ہے۔

پھر ٹیوبوں کو ریڈیائی لہریں پیدا کرنے بھیجنے اور وصول کرنے کے لئے استعمال کیا جانے لگا جس کی وجہ سے پیغام بھیجنے کا فاصلہ مزید بڑھ گیا۔ اسی دوران انسان نے آواز طاقتور بنانے اور ریڈیائی لہروں کے ذریعہ دور تک پہنچانے کا طریق بھی دریافت کر لیا گیا اور انسان گھر بیٹھے ہزاروں میل دور لوگوں سے بات کرنے کے قابل ہو گیا۔ اس تکنیک میں مزید تحقیق و ترقی کے بعد اس وقت انسان دنیا کے کسی مقام سے سے بھی کسی دوسرے مقام تک ٹیلی مواصلاتی رابطہ پیدا کر سکتا ہے۔ اس کام میں عام ٹیلیفون لائنوں کیبلوں سمندروں کی لہروں میں بچھی ہوئی لائنوں اور ریڈیو رابطے کے علاوہ مائکروویو اور مصنوعی سیارے بھی اس کے مددگار ہیں زمین کی حدوں سے بھی پار خلا میں اور چاند پر گھومتے پھرتے خلا نوردوں سے انسان بات چیت کر چکا ہے یہی ریڈیائی لہریں زہرہ اور مریخ کی طرف رواں دواں راکٹوں کو صحیح راستے پر رکھتی ہیں اور ان کی اندرونی حالتوں پر زمینی سائنسدانوں کو آگاہ رکھتی ہیں۔

اس زمانے میں ریڈیو سٹیشن بھی وجود میں آئے جو لوگوں کی عام دلچسپی کے پروگرام مستقل طور پر نشر کرتے رہتے تھے اور لوگ جہاں کہیں بھی ہوں اپنے پسند کے سٹیشن کی نشریات اپنے ریڈیو سیٹ پر وصول کر سکتے تھے۔ یہ سٹیشن دنیا بھر میں اس قدر پھیلے کہ اب ان کا شمار بھی مشکل ہے۔ ان میں بھی کئی اقسام نکل آئیں۔ بعض ریڈیو سٹیشن صرف مقامی نشریات کے لئے مخصوص ہیں۔ (میڈیم ویو یا لانگ ویو۔ MEDIUM WAVE LONG WAVE) اور بعض صرف ہزاروں میل دور پروگرام بھیجنے کے لئے (شارٹ ویو SHORT WAVE) بعض سٹیشن ریڈیائی لہروں کے ذریعہ آواز اس طرح بھیجتے ہیں کہ کسی قسم کا بیرونی شور آواز میں شامل نہیں ہو سکتا۔ (الیف۔ ایم F.M.) وصول ہونے والی آواز ایسی صاف ہوتی ہے جیسے موسیقی یا گفتگو سامنے ہو رہی ہے۔ ایسے اسٹیشن یورپ اور امریکہ میں عام ہیں اور ہمارے یہاں ٹی۔ وی کی آواز اسی طریق پر وصول ہوتی ہے۔ انہی ملکوں میں کئی ریڈیو سٹیشن اب سٹریو موسیقی بھی نشر کرتے ہیں جس سے موسیقی کے مجسم موجود ہونے کا احساس ہوتا ہے۔

آواز کے بعد اگلا قدم متحرک تصویر بھیجنے کا تھا جو ٹیلی وژن کی ایجاد کے ذریعہ سے اٹھایا گیا۔ جو تصویر یا منظر بھیجنا مقصود ہو اسے ٹی وی کیمرے کی ایک سکرین پر منعکس کر دیا جاتا ہے جہاں منفی برقوں کی ایک رو اس کا معائنہ کر کے اسے برقی لہروں میں منتقل کر دیتی ہے جنہیں طاقتور بنا کر نشر کر دیا جاتا ہے۔ ٹی وی ریسیور ان لہروں کو وصول کر کے اور طاقتور بنا کر منفی برقوں کی ایک رَو کو دے دیتا ہے جو سکرین کے پیچھے کام کر رہی ہوتی ہے۔ یہ رو برقی طاقت کی کمی بیشی کے مطابق سکرین پر سیاہ و سفید حصے تعمیر کرتی جاتی ہے اور یوں تصویر کو مکمل کر دیتی ہے۔

اس کے بعد ان تصویروں میں رنگ بھرنے کا شوق پیدا ہوا تو رنگوں کو بھی ایک فارمولے کے تحت ریڈیائی لہروں میں منتقل کیا اور نشر کر دیا۔ وصول کرنے والا ٹی وی اسی فارمولے کے مطابق سرخ۔ سبز اور نیلے رنگوں کی آمیزش سے دوبارہ وہ رنگ تصویر میں بھر دیتا ہے رنگین ٹی وی ترقی یافتہ ممالک میں اب اتنے ہی عام ہیں جتنے یہاں ٹرانسسٹر ریڈیو عام ہیں۔

ٹرانسسٹر کی دریافت نے الیکٹرانکس کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ اس سے قبل ٹیوبوں کے استعمال میں کئی قباحتیں تھیں۔ ایک تو ان کا حجم اور وزن اتنا ہوتا ہے کہ زیادہ تعداد میں استعمال کرنے کے لئے کافی جگہ درکار ہوتی ہے اور وزن اور قیمت میں بھی اسی لحاظ سے اضافہ ہو جاتا ہے پھر ٹیوبیں استعمال کے دوران سخت گرم ہو جاتی ہیں اور انہیں ٹھنڈا رکھنے کے لئے خاص انتظامات کرنے پڑتے ہیں۔ شروع زمانے کی بات ہے امریکہ کی ایک یونیورسٹی میں ایک کمپیوٹر بنایا گیا تھا جس میں ہزاروں ٹیوبیں استعمال کی گئی تھیں۔ اس کمپیوٹر نے یونیورسٹی کا ایک بہت بڑا تہہ خانہ سنبھالا ہوا تھا۔ ٹیوبوں کو ٹھنڈا رکھنے کے لیئے کئی پنکھے لگائے گئے تھے اور ٹھنڈے پانی کے پائپوں کے ذریعہ بھی گرمی کم کرنے کا انتظام تھا۔ پھر بھی کمپیوٹر کے کام کرنے کے دوران کسی کا اس تہہ خانے میں جانا ناممکن تھا۔

اس کے علاوہ ٹیوبوں میں جو ہیٹر لگا ہوتا ہے اس کو چلانے پر کافی بجلی خرچ ہوتی ہے۔ پھر یہ کہ ٹیوبیں عموماً اڑھائی تین سو وولٹ پر کام کرتی ہیں جس سے کرنٹ لگنے کا خطرہ ہر وقت موجود رہتا ہے ان سب قباحتوں کے برعکس ٹرانسسٹر کا ایک تو حجم بہت ہی کم ہے۔ تمام ٹرانسسٹر کسی بھی ٹیوب سے سو دو سو گنا چھوٹا ہے پھر اس میں ہیٹر کا وجود ہی نہیں۔ اس لیے نہ تو گرمی پیدا ہونے کا سوال ہے اور نہ ہیٹروں کو بجلی فراہم کرنے کا۔ پھر یہ کہ ٹرانسسٹر تین سے بارہ وولٹ تک کام کرتا ہے۔ جس سے کرنٹ لگنے کا کوئی خطرہ بھی نہیں۔ ان سب خوبیوں کے بل پر ٹرانسسٹر نے الیکٹرانکس کی ترقی کے لئے نئی راہیں کھول دیں۔ نسبتاً مشکل سرکٹ اب آسانی سے بنائے جا سکتے تھے۔ کمپیوٹر کی ترقی کا سہرا بھی ٹرانسسٹر کے سر ہی ہے۔

کمپیوٹر میں ٹرانسسٹر کو سوئچ کے طرز پہ استعمال کیا جاتا ہے جس طرح سوئچ یا تو آن ہوتا تھا۔ یا آف۔ اسی طرح کمپیوٹر میں استعمال ہونیوالے ہزاروں ٹرانسسٹر آن یا آف ہونے کی مختلف حالتوں میں ہوتے ہیں۔ اسی وجود اور عدم موجود کے مرکبات پر کمپیوٹر کے سارے حساب کتاب کا دارومدار ہے کمپیوٹر فیصلے بھی اسی طرز پر کرتا ہے کہ جس جواب کے تمام لوازمات موجود ہوں اس کے حق میں فیصلہ کر دیتا ہے یہ لوازمات فراہم کرنا اور کمپیوٹر کو ہدایات دینا انسان کا کام ہوتا ہے

کمپیوٹر کی ایجاد سے انسان کے کئی کام آسان ہو گئے اور کئی کام جو ناممکن تھے وہ ممکن ہو گئے۔ حساب کتاب میں اور مختلف امکانی صورتوں میں سے کامیاب

صورتوں کا فیصلہ کرنے میں تو کمپیوٹر مشّاق ہی ہے۔ جو کام بھی بار بار کرنے کا ہو چاہے کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو بلا خوف و خطر کمپیوٹر کے حوالے کیا جا سکتا ہے مثلاً فیکٹریوں میں جو مشینی پرزہ جات تیار ہوتے ہیں ان کے بنانے میں جن جن مراحل سے گزرنا ہوتا ہے وہ کمپیوٹر کو بتا دیئے جاتے ہیں اور پھر بغیر انسانی دخل کے اور بغیر غلطی یا کمی بیشی کے یہ سب خود بخود تیار ہوتے رہتے ہیں۔ اسی طرح ہوائی جہازوں کو پرواز کے دوران اطمینان سے کمپیوٹر کے حوالے کر دیا جاتا ہے اور اڈے پر اترتے وقت بھی اسی کی مدد شامل حال ہوتی ہے پھر چاند کی طرف محو سفر راکٹ کے تمام کام اگر خلا نورد کو کرنے ہوتے تو وہ چند ثانیوں میں پاگل ہو جاتا۔ یہ تمام کام چھوٹے بڑے کمپیوٹر خلائی جہاز میں اور زمین پر انجام دے رہے ہوتے ہیں اور خلا نورد کو کھانے پینے اور باتیں کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔

اسی طرح۔ اور ہزاروں کام الیکٹرانکس کی پراسرار دنیا انسان کے لئے اسی وقت کر رہی ہے۔ جن کو اگر صرف گن یا ہی جائے تو کئی صفحے بھر جائیں اور لکھا جائے تو ہر ایک کے لیے ایک الگ مضمون درکار ہو۔

حاصل کلام یہ کہ جو احمدی نوجوان ذہین اور قابل ہیں اور اپنی طبیعتوں کو اس طرف مائل پاتے ہیں وہ الیکٹرانکس کے علم میں آگے قدم بڑھائیں اور اسے اللہ تعالے کی مرضی اور منشاء کے مطابق انسان کی خدمت کے لئے مسخر کر دیں۔ ؛ ..

○

غزل

جناب فیض چنگوی

*

نگہِ خاموش بے آوازِ فریاد و فغاں تک ہے
بیانِ داستانِ غم فقط اشکِ رواں تک ہے

جبینِ شوق سجدہ ریز دعائیں عرشِ اعلےٰ پر
مری آہِ رسا کی حد خدا کے آستاں تک ہے

ہمارے عزم و ہمت کے سفر کی حد نہ پوچھو تم
کہ یہ ذوقِ عمل اپنا بہارِ بے خزاں تک ہے

ہمارا خوں رگِ گل میں رواں ہے ہر گلستاں میں
ہماری جراتوں کا غلغلہ کون و مکاں تک ہے

فسونِ دہر خندہ گل یا تزئینِ چمن ہر شے
بہارِ دلنوازی آمدِ عہدِ خزاں تک ہے

شفق کی سرخیوں میں عکس ہے اشکِ پیازی کا
یہی تو سلسلہ نرگس سے شاخِ زعفراں تک ہے

یہ زہدِ خشک تیرا رحم کے قابل ہے اے زاہد
کہ جس کی دوڑ مسجد تک، مصلے تک، اذاں تک ہے

خدا کی معرفت حاصل نہ تجھ کو ہے یقیں حاصل
یہ تیری بندگی کا ذوق بھی وہم و گماں تک ہے

انہیں اے فیض مال و زر کا احساسِ زیاں کیوں ہو
کہ پیمانِ وفا جن کا نثارِ نقدِ جاں تک ہے

*

جناب سعید المنان ناہید

دیارِ عشق درخشاں نہیں، تو کچھ بھی نہیں
حریمِ حسن! یہ احساں نہیں، تو کچھ بھی نہیں
نظر نظر ہے فقط وسعتِ نظر کے طفیل
جو کائنات بداماں نہیں، تو کچھ بھی نہیں
ترے ورود سے ویرانۂ محبت میں
نمودِ صبحِ بہاراں نہیں، تو کچھ بھی نہیں
تجھے خبر ہے مقامِ فقیرِ خاک نشیں
شکوہ و عظمتِ شاہاں نہیں، تو کچھ بھی نہیں
کمندِ علم جو بامِ فلک پہ ڈالی تو کیا
ادا شناسئ قرآں نہیں، تو کچھ بھی نہیں
بجھے چراغ بھی روشن کرو کبھی ناہید
جو دل کے داغ فروزاں نہیں، تو کچھ بھی نہیں

○

اگر رازداں میں بتاؤں تو کس کو
یہ داغِ جگر میں دکھاؤں تو کس کو
تری بزم سے کتنا دلگیر لوٹا
میں اپنی حکایت سناؤں تو کس کو
مرے ہمسفر تو ہوئے آبلہ پا
نیا ہمسفر میں بناؤں تو کس کو
بہاروں سے مایوس اہلِ چمن ہیں
بہاروں کا مژدہ سناؤں تو کس کو
بدل دی ہیں رندوں نے اقدار اپنی
مئے ارغوانی پلاؤں تو کس کو
کوئی گلبدن کیوں مرے گھر پہ آئے
سرِ دشت آخر بلاؤں تو کس کو
ہوا ختم شبیر دورِ مروت
دلی دوست اپنا بناؤں تو کس کو

جناب چوہدری شبیر احمد (واقفِ زندگی)

شعبۂ "تحریکِ جدید" کے زیرِ انتظام

عالمگیر زبانوں کے اجلاس کا وسیع پیمانہ پر انعقاد

اکنافِ عالم سے تشریف لانے والے احمدی جماعتوں کے نمائندوں کی دُنیا کی ۸ مختلف زبانوں میں ایمان افروز تقاریر

جماعت احمدیہ کے مقدس و بابرکت ۸۳ ویں جلسہ سالانہ کے موقع پر بتاریخ ۲۷ر دسمبر ۱۹۷۵ء بوقت ساڑھے سات بجے شام شعبہ تحریک جدید مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ کے زیرِ اہتمام مسجد اقصیٰ میں حسب سابق "عالمگیر زبانوں کا اجلاس" منعقد ہوا جس کی صدارت کے فرائض محترم صاحبزادہ مرزا طاہر احمد صاحب نے ادا فرمائے اور سٹیج سیکرٹری کے فرائض مکرم مبارک احمد صاحب طاہر مہتمم تحریک جدید مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ نے انجام دیئے۔ احباب جماعت بڑی کثرت کے ساتھ اس اجلاس میں شامل ہوئے۔ اس ایمان افروز اجلاس میں اکنافِ عالم سے آنے والے ۸ مخلص اور فدائی احمدی احباب نے جو دنیا کے مختلف ممالک کی احمدی جماعتوں کی نمائندگی کرتے تھے اپنے ایمان افروز خیالات کا اظہار فرمایا اور اسلام اور احمدیت کے متعلق مخلصانہ جذبات پیش کئے۔ اجلاس کی کارروائی تلاوتِ قرآن کریم سے شروع ہوئی جو مکرم ملک منصور احمد صاحب عمر شاہد نے کی جس کے بعد مکرم چوہدری شبیر احمد صاحب نے خوش الحانی کے ساتھ ایک نظم پڑھی۔

بعدہٗ محترم صدر صاحب نے اس اجلاس کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے فرمایا "—— اللہ تعالیٰ نے مسیح پاک علیہ السلام سے وعدہ فرمایا تھا کہ "میں تیری تبلیغ کو زمین کے کناروں تک پہنچاؤں گا۔" یہ ایمان افروز اجلاس اسی وعدہ کے پورا ہونے کی عملی اور جیتی جاگتی تصویر پیش کرتا ہے جبکہ اکنافِ عالم سے آنے والے احمدی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا پیغام سن کر اور اسے دل سے قبول کر کے اللہ اور اس کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ جمیل سننے کے لیے اور امام وقت ایدہ اللہ تعالیٰ اور اپنے پاکستانی بھائیوں سے ملاقات کے لیے دُور دراز سے ہزاروں میل کا سفر طے کر کے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ اس اجلاس میں مختلف ممالک کے احمدی بھائی مسیح پاک علیہ السلام کی رقم فرمودہ ایک تحریر کے اقتباس کا اپنی اپنی زبان میں ترجمہ پیش کریں گے جو یقیناً ہم سب کے لئے ازدیادِ ایمان کا باعث ہوگا۔ انشاء اللہ!"

صدر محترم کے ان ارشادات کے بعد سب سے پہلے محترم مسعود احمد خان صاحب دہلوی ایڈیٹر روزنامہ الفضل نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تحریر فرمودہ مندرجہ ذیل ایمان افروز اردو عبارت حضور کی تصنیف "کشتی نوح" میں سے پڑھ کر سنائی:۔

"ہمارا بہشت ہمارا خدا ہے۔ ہماری اعلیٰ لذّات ہمارے خدا میں ہیں کیونکہ ہم نے اس کو دیکھا اور ہر ایک خوبصورتی اس میں پائی۔ یہ دولت لینے کے لائق ہے اگرچہ جان دینے سے ملے اور یہ لعل خریدنے کے لائق ہے اگرچہ تمام وجود کھونے سے حاصل ہو۔ اے محرومو! اس چشمہ کی طرف دوڑو کہ وہ تمہیں سیراب کرے گا۔ یہ زندگی کا چشمہ ہے جو تمہیں بچائے گا۔ میں کیا کروں اور کس طرح اس خوشخبری کو دلوں میں بٹھا دوں۔ کس دف سے میں بازاروں میں منادی کروں کہ تمہارا یہ خدا ہے تا لوگ سن لیں۔ اور کس دوا سے علاج کروں تا سننے کے لیے لوگوں کے کان کھلیں۔"

بعد ازاں اکناف عالم سے آنے والے معزز مہمانوں کی تقاریر کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہر مقرر تشریف لا کر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی رقم فرمودہ مندرجہ بالا عبارت کا اپنی زبان میں ترجمہ پیش کیا۔ یہ سلسلہ مسلسل اڑھائی گھنٹے تک جاری رہا۔

اجلاس کے دوران محترم چوہدری شبیر احمد صاحب، مکرم محمد پریل صاحب سندھی۔ مکرم ماسٹر محمد انور صاحب مکرم منیر الاسلام صاحب انڈونیشین نے خوش الحانی سے نظمیں پڑھ کر سنائیں۔

دس بجے رات جب اس دلچسپ اور ایمان افروز اجلاس کی کارروائی ختم ہوئی تو صدر محترم کے ارشاد پر مکرم مسٹر مرتو لو صاحب جو انڈونیشین وفد کے امیر تھے نے اجتماعی دعا کرائی۔ اس دعا پر یہ اجلاس بخیر و خوبی اختتام پذیر ہوا۔ الحمد للہ!

(روزنامہ الفضل ربوہ ۔ ۶ر جنوری ۱۹۷۶ء)

گھوڑ دوڑ ٹورنامنٹ سے متعلق

حضرت خلیفۃ المسیح الثالث ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی نصیحت

حضور فرماتے ہیں:-

"بعض لوگ گھوڑے مانگ کر لے آتے ہیں۔ کسی چیز کا مانگنا تو ویسے ہی بُری بات ہے چہ جائیکہ گھوڑے مانگنا۔ یہ تو گھوڑے کو ذلیل کرنے والی بات ہے۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِّنَ الْيَدِ السُّفْلٰى (صحیح بخاری) مانگنے والا ہاتھ خیر نہیں چونکہ خیر ملتی ہے اس لئے اس ہاتھ سے لوگوں کو خیر کس طرح مل جائیگی جو خیر نہیں رہا کیونکہ خیر، خیر کو اسی طرح کھینچتی ہے جس طرح نور نور کو جذب کرتا ہے پس دوستوں کو میں نصیحت کرتا ہوں کہ وہ گھوڑے مانگ کر نہ لائیں بلکہ اپنے گھوڑے رکھیں۔ ان پر سواری کیا کریں۔ ان سے کام لیا کریں۔ ان سے پیار بھی کریں۔ اور ان کی خدمت بھی لیں ان کو لمبا اور تیز چلنے کی عادت بھی ڈالیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو اس کی سمجھ بھی عطا کرے اور نیکی کے کام اور خیر کے حصول کی سعی میں برکت کی توفیق بھی دے۔ آمین!"

امید ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ ماہ فروری میں گھوڑ دوڑ ٹورنامنٹ ہو گا۔

تاریخوں کا اعلان بعد میں کیا جائے گا

(مہتمم صحت جسمانی
خدام الاحمدیہ مرکزیہ ربوہ)

ربوہ کے شب و روز

تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں

دو بابرکت تقاریب

اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی دی ہوئی توفیق سے سٹوڈنٹس یونین گورنمنٹ تعلیم الاسلام کالج کو دو بابرکت تقاریب منعقد کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ۲۱ر جنوری بروز بدھ شام چار بجے کالج ہال میں "مقابلہ حسن قرأت" اور ۲۵ر جنوری بروز اتوار صبح دس بجے "سیرت کانفرنس" کا انعقاد ہوا ہر دو تقاریب میں طلباء و اساتذہ نے ذوق و شوق اور عقیدت کے ساتھ شمولیت کی۔ مقابلہ قرأت میں حافظ سمیع اللہ، محمد اقبال اور حافظ محمد علی بالترتیب اول، دوم، سوم قرار پائے جبکہ حوصلہ افزائی کا انعام حافظ محمد حیات کو دیا گیا۔ سیرت کانفرنس کے مندرجہ ذیل تین مواضیع مقرر تھے:-

(۱) حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت محسن انسانیت
(۲) حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت حاکم
(۳) حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمنوں سے حسن سلوک

اس مقابلہ میں شمس الحق طیب، احسان الحق پرویز، اور آفتاب احمد بالترتیب اول، دوم و سوم انعامات کے مستحق قرار پائے۔ حوصلہ افزائی کا انعام سید تقدیر عباس کو دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ تقاریب طلبہ میں حقیقی اسلام کی روح پھونکنے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ پر عمل پیرا ہونے کی کوشش میں ممد و معاون ثابت ہوں۔ (آمین!)

(نمائندہ خصوصی)

نئی اور پرانی موٹروں کی
خرید و فروخت کا مرکز
لطیف موٹرز
۲۴۔میکلوڈ روڈ۔لاہور
(فون نمبر ۴۴۵۵۹)
یہاں آپ اطمینان اور پوری تسلی کے ساتھ اپنی کار فروخت
کر سکتے ہیں اور ضرورت کے مطابق نئی یا پرانی کار
خرید سکتے ہیں

ہر قسم کے
ٹیلی ویژن
خریدنے کیلئے تشریف لاویں
پتہ
(فون نمبر ۳۵۴۴)
انوار جنرل سٹور اینڈ
ٹیلیویژن سنٹر
چوک فوارہ
اوکاڑہ
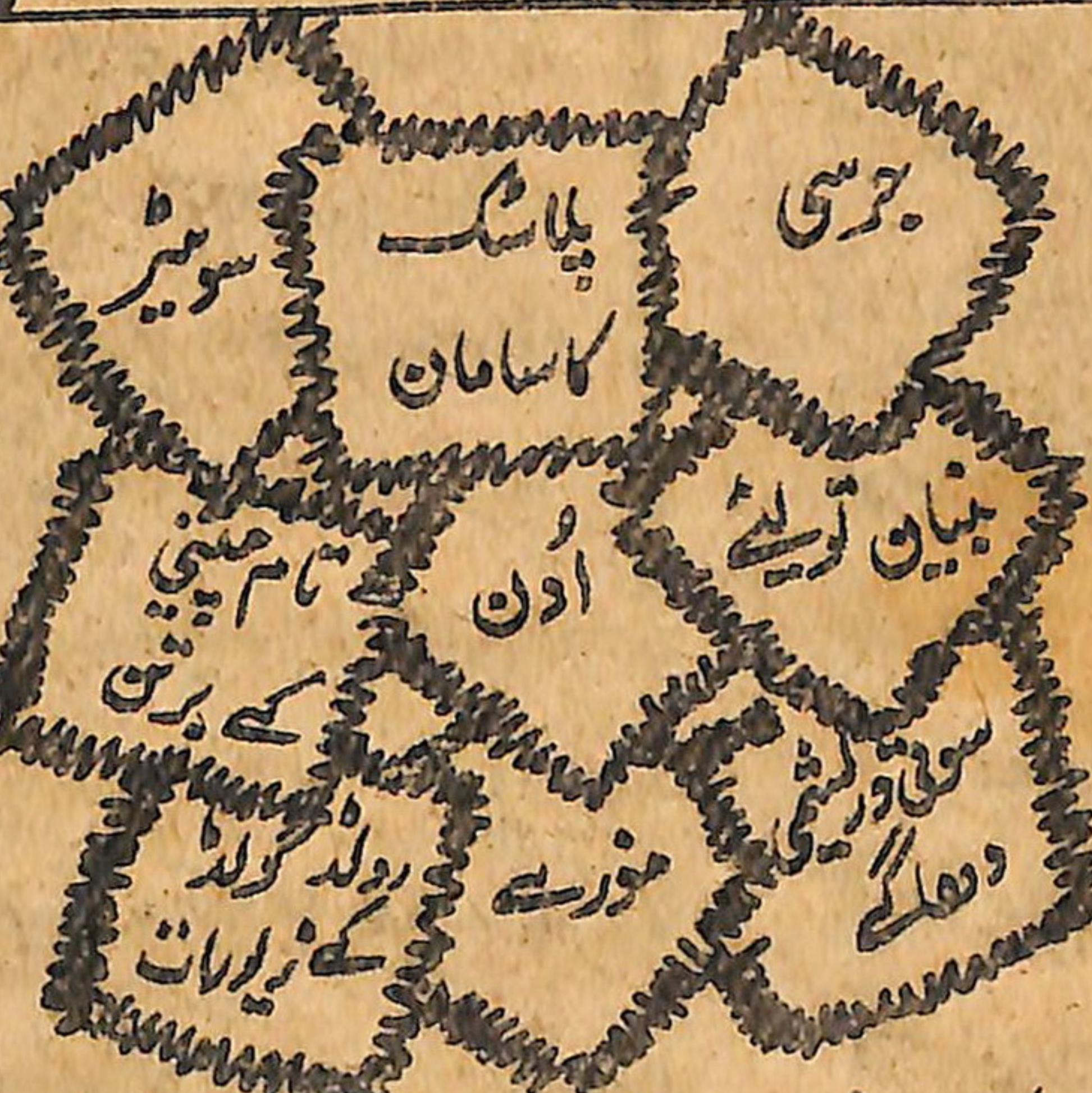
جناب شیخ عبدالقادر لاہور

ذرا پیچھے کی طرف اے گردشِ ایّام تو

شاعرِ مشرق علامہ اقبالؔ کی صد سالہ جوبلی کی تقریبات جوں جوں قریب آرہی ہیں۔ بزمِ اقبال کی رونق اور ہماہمی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ فیض احمد فیضؔ اور صفدر میرؔ بھی علامہ اقبال کے فلسفہ اور علمِ کلام پر بہت کچھ لکھنے کے لئے تُل رہے ہیں۔ بعض لوگ احتجاجاً یہ کہہ رہے ہیں کہ ترقی پسندوں اور سُرخوں کو اس کی اجازت نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ علامہ اقبال پر کچھ لکھ سکیں ——— ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کا خیال یہ ہے کہ شاعرِ مشرق کی زندگی کا کون سا گوشہ ہے جو یارانِ محفل بے نقاب نہیں کر چکے

——— ان کے متروکہ اشعار

——— عطیہ کے نام ان کے خطوط

——— دوسرے مکاتیب اور دستاویزات

سب کچھ بڑے طمطراق سے شائع کیا جا چکا ہے اگر فیض احمد فیضؔ اور صفدر میر کی دو کتابیں بھی منظرِ عام پر آگئیں تو کونسا آسمان ٹوٹ پڑے گا۔ قیامت آجائے گی۔ گزشتہ دنوں نوائے وقت نے بھی علامہ اقبال کی ایک انگریزی تحریر کا عکس شائع کیا جس میں کسی صاحب کو "وفاداریٔ سرکار انگلشیہ" کا سرٹیفکیٹ دیا گیا ہے۔ جب امروز نے یہ تحریر شائع کی تو اخبار کے شروع سے قبل ہی ہمارے پرچے ضائع کر دیئے گئے لیکن نوائے وقت نے اسے بلا کم و کاست شائع کر دیا۔ مولانا ظفر علی خان نے بھی کہا تھا۔ "سرکار کی دہلیز پہ سر ہو گئے اقبالؔ"

جناب غلام احمد پرویزؔ کی حالت ان دنوں قابلِ رحم ہے انہیں یہ غم کھائے جا رہا ہے کہ کہیں یہ ثابت نہ ہو جائے کہ:۔

علامہ اقبال میرزا غلام احمد کے دعویٰ
کی صداقت کے قائل تھے اور ان کی جماعت
کی حقانیت کے معترف!

چنانچہ پچھلے دنوں انہوں نے بتقریب یومِ اقبال ایک مقالہ داغ دیا کہ اس باب میں احمدی حضرات بڑی تلبیس سے کام لے رہے ہیں۔ علامہ اقبال کا احمدیت سے کیا تعلق؟ ———

آج ضرورت اس امر کی ہے کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی مذہبی زندگی کے سارے ہی رُخ دنیا کے سامنے پیش کر دیئے جائیں اور فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیا جائے جو تاثر بھی اُن کا ذہن چاہے قبول کرے۔ یہ کیا ہوا کہ:۔

"میٹھا میٹھا ہڑپ اور کڑوا کڑوا تھو"

اتنا تو خیر جناب غلام احمد پرویز کو بھی تسلیم ہے کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کے والد محترم نے باقاعدہ طور پر جماعت احمدیہ میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ جس کے باعث زمانہ طالبعلمی میں ڈاکٹر اقبال خود کو احمدی کہتے رہے۔ لیکن بعد میں باپ بیٹا

دونوں برگشتہ ہوگئے۔ پرویز صاحب کا ذہن ——— غالباً یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال قادیان بھی تشریف لے گئے تھے اور آپ نے بانی سلسلہ احمدیہ کے ہاتھ پر بیعت کر کے جماعت میں باقاعدہ شمولیت اختیار کر لی تھی۔

آج اس باب میں بعض شہادتیں پیش ہیں:۔

پہلی شہادت

۱۹۵۳ء میں تحقیقاتی عدالت کے روبرو جب یہ مسئلہ زیر بحث آیا۔ جہاں خواجہ نذیر احمد صاحب بار ایٹ لاء نے اپنے بیان میں بتایا تھا کہ ۱۸۹۳-۹۴ء میں علامہ اقبال نے بیعت کی تھی۔ جب وہ یہ بیان دے کر باہر دم میں تشریف لے گئے تو مولانا غلام محی الدین قصوری ایڈووکیٹ نے انہیں بتایا کہ بیعت کا واقعہ ۱۸۹۷ء کا ہے ۹۴-۱۸۹۳ء کا نہیں اس کی تصحیح کر دینا چاہیئے۔ چنانچہ خواجہ نذیر احمد صاحب نے تحقیقاتی عدالت میں اپنے پہلے بیان میں ترمیم کے لئے درخواست کی اور بتایا کہ مجھے غلام محی الدین قصوری ایڈووکیٹ نے صحیح سن بتا دیا ہے ڈاکٹر سر محمد اقبال نے ۹۴-۱۸۹۳ء میں نہیں بلکہ ۱۸۹۷ء میں بیعت کی تھی۔

یہ سب کچھ پاکستان کی مشہور و معروف شخصیت مولوی غلام محی الدین قصوری ایڈووکیٹ کے سامنے ان کی زندگی میں ہوا اور تواتر وقت میں تحقیقاتی عدالت کی یہ رپورٹ شائع شدہ موجود ہے صاحب موصوف نے اس کی کبھی تردید نہیں کی اس لئے کہ:۔

مولوی غلام محی الدین قصوری بخوبی جانتے تھے کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے ۱۸۹۷ء میں باقاعدہ طور پر بیعت کی تھی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کی معلومات کے ذرائع کیا ہے۔ انہی ذرائع کے انکشاف کے لئے آج میں نے قلم اٹھایا ہے۔

اصل واقعہ

اصل واقعہ یہ ہے کہ اپنے والد ماجد کے مخلص احمدی ہونے کے باعث مولوی غلام محی الدین قصوری احمدی تو پہلے سے تھے لیکن بیعت انہوں نے ڈاکٹر سر محمد اقبال کے ساتھ ہی کی۔

مدرجہ ۱۸۹۷ء میں مولوی غلام محی الدین قصوری۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال اور چودھری شہاب الدین نے جو بعد میں سر شہاب الدین بن گئے۔ قادیان جا کر ایک وقت حضرت میرزا صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ہم یہاں تاریخ کا ایک فراموش شدہ باب درج کرتے ہیں۔ جس سے وہ سارے پردے اٹھ جائیں گے جو مولوی غلام محی الدین قصوری کی معلومات کے ذرائع اور ڈاکٹر سر محمد اقبال کی جماعت احمدیہ میں شمولیت پر پڑے ہوئے ہیں۔

مولوی غلام محی الدین قصوری جماعت احمدیہ کے ایک فرد رہ چکے ہیں۔ اس کا ثبوت حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کی کتاب انجام آتھم ہے جس کے آخری صفحات میں ۳۱۳ اصحاب کے نام درج ہیں مولوی غلام محی الدین قصوری اور ان کے والد ماجد ڈاکٹر بوڑے خان صاحب

قصوری کا نام علی الترتیب ۱۶۲۔۱۶۰ اور ۱۶۵ میں
نمبر پر ہے۔
مزید براں "لاہور تاریخ احمدیت" میں ڈاکٹر غلام محمد صاحب (۱۸۹۰ء-۱۹۴۹ء)
نور میو کا بیان بایں الفاظ درج ہے:۔
"۔۔۔۔ مارچ ۱۸۹۷ء میں ہم لاہور
کے چند نوجوانوں نے جو سارے کے سارے
تعلیم یافتہ تھے اور جن کی صحیح تعداد یاد نہیں
رہی۔ ارادہ کیا کہ حضرت مرزا صاحب کو
قادیان جاکر دیکھنا چاہیئے کیونکہ باہر تو
انسان تصنع سے بھی بعض کام کر سکتا ہے
لیکن اگر اُس کے گھر میں جاکر اسے دیکھا جائے
تو اصل حقیقت سامنے آجاتی ہے۔
خیر ہم حضرت اقدس کے دعویٰ کی حقیقت
معلوم کرنے کے لئے عازم قادیان ہو
گئے۔ ہم میں سے ہر شخص نے الگ الگ
اعتراضات سوچ لئے تھے جو وہ کرنا چاہتا
تھا۔ مولوی محمد علی صاحب۔ خواجہ کمال الدین
صاحب۔ ڈاکٹر محمد اقبال صاحب مولوی
غلام محی الدین صاحب قصوری۔ چوہدری
شہاب الدین صاحب۔ مولوی سعد الدین
صاحب (بی اے ایل ایل بی) وغیرہ بھی
اس قافلہ میں شامل تھے۔ خواجہ کمال الدین
صاحب جو ۱۸۹۳ء میں بیعت کرکے سلسلہ
عالیہ میں داخل ہو چکے تھے۔ آپ چونکہ اس
پارٹی اور خصوصاً مولوی محمد علی صاحب
کو تبلیغ کیا کرتے تھے اس لئے آپ بھی ہمارے ساتھ گئے
تھے جب ہم قادیان پہنچے تو گول کمرہ میں ہمارے لئے
ملاقات کا انتظام کیا گیا۔ حضور جب تشریف لائے تو آتے ہی ایک ایک
اعتراض کو لیکر اس کا جواب دینا شروع کیا حتیٰ کہ ہم سب کے
اعتراضات کا مکمل جواب آگیا۔ تب ہم
ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر تعجب کرنے لگے
کہ یہ کیسے ہوا؟ جب ہم باہر نکلے تو بعض
نے کہا یہ جادوگر ہے۔ چودھری شہاب الدین
صاحب اور مولوی محمد علی صاحب وغیرہ نے
کہا کہ یہ ضرور سچا ہے ہم تو بیعت کرتے
ہیں۔ چنانچہ مولوی محمد علی صاحب چوہدری
شہاب الدین صاحب۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال
اور مولوی غلام محی الدین صاحب قصوری
اور خاکسار نے بیعت کر لی بعض اور لوگوں
نے بھی بیعت کی تھی۔ مگر ان کے نام مجھے
یاد نہیں رہے۔ اندازاً بارہ ۱۲ تیرہ ۱۳ آدمیوں
نے بیعت کی تھی۔"
(لاہور تاریخ احمدیت ص۲۳ مؤلفہ شیخ عبدالقادر نو مسلم۔
(سابق سوداگرمل مرحوم و مغفور)

ایک اور شہادت

یہ بیان اصل حقیقت کو مبرہن کرنے کے لئے کافی ہے
کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال پہلے اپنے والد ماجد کے احمدی ہونے کے
باعث احمدی کہلاتے رہے۔ جیسا کہ خود پرویز صاحب نے حوالہ
دیا ہے پھر باقاعدہ طور پر احمدی ہوئے لیکن بعد میں انہوں نے

سلسلہ احمدیہ سے اپنا تعلق استوار نہیں رکھا۔ ہاں مدّاح ضرور ہے ——— جیسا کہ علامہ نیاز فتحپوری سے کسی نے پوچھا کہ ڈاکٹر اقبال احمدیت کے بہت مخالف تھے تو انہوں نے جواباً لکھا:۔

"——— علامہ اقبال کی جس تحریر کا آپ نے حوالہ دیا ہے۔ وہ ۱۹۳۴ء کے بعد کی ہے جب احرار کی شورش سے مرعوب ہو کر اپنی جان بچانے کے لئے وہ اس بیان کے دینے پر مجبور ہو گئے ورنہ اس سے قبل وہ احمدیت کے بڑے مدّاح تھے چنانچہ حضرت مرزا صاحب کی وفات کے دو سال بعد علی گڑھ کے اسٹریچی ہال میں انہوں نے جو تقریر کی تھی اس کا ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ ——— 'پنجاب میں اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ اس جماعت کی شکل میں ظاہر ہوا ہے جسے فرقہ احمدیہ کہتے ہیں' ———"

(ماہنامہ نگار ستمبر ۱۹۶۱ء)

اس تحقیق سے یہ امر بالکل واضح ہو چکا ہے کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی احمدیت پر پردہ ڈالنے کی قطعاً ضرورت نہیں کوئی مؤرخ ان کے قبول احمدیت کے واقعہ کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

جناب غلام احمد پرویز احمدیوں کو تلبیس کا طعنہ دیتے ہیں لیکن مستقبل کے مؤرخ کا قلم تو وہ نہیں تھام سکتے۔ اصل حقائق آج نہیں تو کل بے نقاب ہو جائیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ ———

علامہ کے جوبلی کے سال میں سارے تاریخی حقائق (بے کم و کاست) منظرِ عام پر لائے جائیں۔

○

ایتو میاتھی

نثار احمد ناز سرا۔ دیپا خان مری۔ سندھ

آخری سپاہی

گزشتہ جنگ عظیم کے دوران ایتو میاتھی جاپان کی فوج میں لانس کارپورل تھا۔ وہ جنگ ختم ہونے کے سولہ سال بعد تک بحرالکاہل کے ایک جزیرے میں جاپانی فوج کے بیڑے کا انتظار کرتا رہا۔ وہ اپنی عجیب و غریب کہانی خود بیان کرتا ہے:

میں نے سولہ برس بعد جاپان میں اپنی قبر دیکھی۔ قبر کے پتھر پر میرا نام لکھا تھا:۔

" ایتو میاتھی۔ پیدائش سنہ ۱۹۲۱ء
تیئس (۲۳) برس کی عمر میں گوام کے
جزیرے میں ۳۰ ستمبر سنہ ۱۹۴۴ء کو لڑتا
ہوا مارا گیا۔"
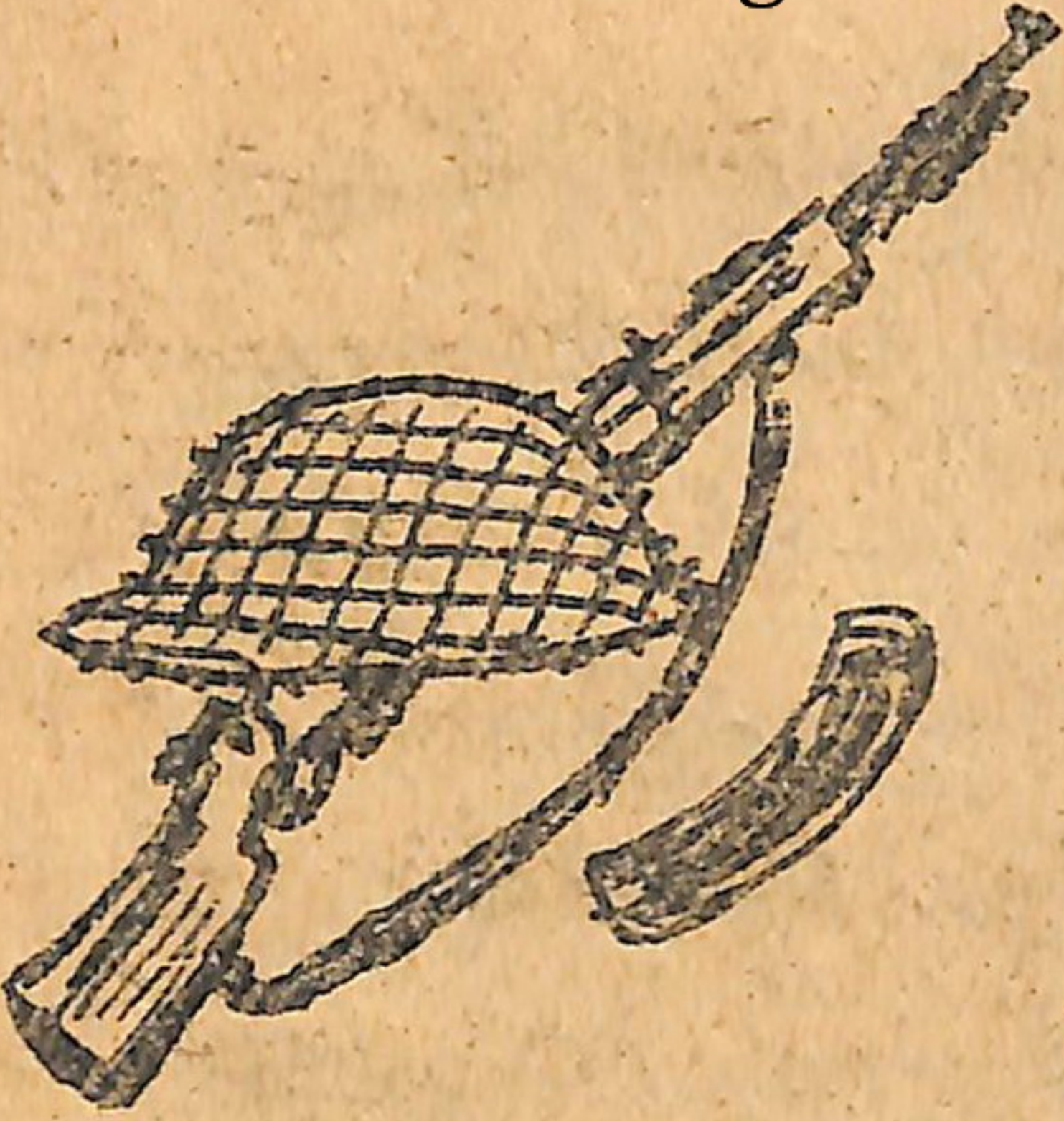
اپنی قبر دیکھ کر مجھے ہنسی بھی آئی اور دل پر دہشت سی بھی طاری ہوئی۔ لیکن یہ دہشت زیادہ دیر نہ رہی کیونکہ اس قبر میں میری لاش نہیں تھی۔ میں زندہ تھا۔ میرے باپ نے میری لاش کے بغیر ہی میری قبر بنا ڈالی تھی بھلا کون یقین کر سکتا تھا کہ جنگِ عظیم ختم ہونے کے سولہ سال بعد تک غیر حاضر سپاہی زندہ ہوگا۔ میری یونٹ والوں نے میرے باپ کو بتا دیا تھا کہ ایک خون ریز اور گھمسان کے معرکہ میں میں لاپتہ ہو گیا تھا اور میں یقیناً مارا گیا تھا۔

قصہ یوں ہے کہ میری پلٹن مارچ سنہ ۱۹۴۴ء میں بحرالکاہل کے جزیرہ گوام میں بھیجی گئی۔ امریکیوں کا شدید ترین جوابی حملہ شروع ہو چکا تھا۔ امریکی ائیر فورس نیوی اور آرمی قیامت بپا کئے ہوئے تھیں۔ ہم ہر جزیرے کے دفاع میں جان کی بازی لگا کر لڑ رہے تھے۔ گوام پر بھی امریکیوں نے حملہ کیا۔ ہم سینہ سپر ہو گئے۔ یہ جزیرہ گھنے اور دشوار گزار جنگلوں میں چھپا ہوا تھا۔ گھاس اتنی اونچی کہ انسان چھپ جاتا ہے۔ جنگل میں ٹیلے ٹیکریاں بھی تھیں اور ندی نالے بھی۔

ایک روز میری پلاٹون گشت پر تھی کہ ہم گھیرے میں آگئے۔ ہمارا بہت نقصان ہوا۔ ہم بچے کھچے سپاہی گھیرے سے نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے کہ میرے ایک بوٹ کا تسمہ کھل گیا۔ میں تسمہ باندھنے رک گیا اور اپنے ساتھیوں سے بہت پیچھے رہ گیا۔ بس اتنی سی بات نے میری جان بچائی اور اسی ذرا سی بات نے جنگِ عظیم کی عجیب و غریب کہانی کو جنم

دیا۔ میں نے اُٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ میرے ساتھی جنگل میں روپوش ہو چکے تھے اور میں اکیلا رہ گیا تھا۔ اب امریکی فوج کے گرنیڈ مجھ سے آگے گر رہے تھے۔ میں چھپ گیا اور امریکی مجھ سے آگے نکل گئے۔

پناہ گاہ سے نکلنا خودکشی کے مترادف تھا لیکن چھپے رہنا بھی بہادری نہیں تھی۔ میں نے چند روز انتظار کیا اور کیڑوں کی طرح جھاڑیوں اور گھاس میں رینگ رینگ کر صورتِ حال کا جائزہ لیتا رہا۔ تھوڑے ہی دنوں میں جزیرے میں جنگ ختم ہو گئی اور جزیرے پر امریکیوں کا قبضہ ہو گیا۔ انہوں نے وہاں تھوڑی سی فوج چھوڑ دی اور اگلے جزیرے پر حملہ آور ہوئے۔

میری زندگی رینگتے ہوئے یا رات کے وقت کمزور سے جنگلی جانور کی طرح خوراک اور پانی تلاش کرتے گزرنے لگی۔ اسی دوران مجھے جاپان کی شکست خوردہ فوج کے کئی ایک سپاہی ملے جو میری طرح چھپ چھپ کر جی رہے تھے۔ مگر ان میں سے کوئی بھی میرا ساتھ نہ دے سکا۔ بعض کھانے پینے کی تلاش میں نکلے تو انہیں امریکیوں نے پکڑ لیا۔ بعض کو گوام کے مقامی باشندوں نے پکڑ کر مار ڈالا۔ وہ لوگ جاپانیوں سے نفرت کرتے تھے۔ کیونکہ جاپانیوں نے انہیں بہت پریشان کیا تھا۔ میرے بیشتر ساتھی فاقہ کشی اور جنگل کی مہلک بیماریوں کی نذر ہو گئے اور میرے ساتھ صرف ایک ساتھی میناکاوا رہ گیا۔ میرے پاس اپنی رائفل تھی اور آٹھ کارتوس۔

ہم دونوں جنگل میں چھپ چھپ کر زندگی گزارنے لگے۔ اسی دوران جنگِ عظیم ختم ہو گئی ہمیں کچھ علم نہ تھا کہ جنگ ختم ہو گئی ہے اور ہمارے دو بڑے شہر ہیروشیما اور ناگاساکی کرۂ ارض سے ایٹم بم سے صاف کئے جا چکے ہیں۔ ہم دونوں اسی انتظار میں رہے کہ جاپان کی فوج جزیرے پر قبضہ کرنے آئے گی اور ضرور آئے گی۔ ہم کسی قیمت پر شکست تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ ہمیں دنیا کی کیا خبر ہوتی؟ ہمیں تو اسی جزیرے کے متعلق بھی پوری طرح علم نہیں تھا جہاں ہم چھپے ہوئے تھے

ہم نے کئی جگہ غاریں بنا لیں اور انہیں جھاڑیوں وغیرہ سے ڈھک دیا۔ ہم دونوں ایک غار میں زیادہ عرصہ نہیں رہتے تھے چند دن ایک غار میں گزار کر دوسرے غار میں چلے جاتے تھے کیونکہ امریکی سپاہی گشت کرتے رہتے تھے۔ ان کے علاوہ وہاں کے مقامی باشندے بھی بندوقیں اٹھائے شکاری کتوں کی مدد سے پیچھے پیچھے جاپانیوں کا شکار کھیلتے رہتے تھے۔ ان خونخوار کتوں سے بچے رہنا اور اُن تک اپنی بو نہ پہنچنے دینا آسان نہ تھا۔ بعض اوقات ہم جنگلی چوہوں کی طرح گھاس اور جھاڑیوں میں رینگ رینگ کر کتوں سے بچتے تھے اور جہاں کہیں کھوہ یا غار مل جاتا اسی میں گھس جاتے تھے۔ اب ہمیں وقت کا ذرہ بھر احساس نہ تھا۔ نہ یہ علم تھا کہ کتنے دن گزر گئے ہیں۔ یہ کون سا مہینہ ہے یا سال۔ ایک وقت آیا کہ سوچنے کی صلاحیت بھی ختم ہو گئی اور صرف ایک خیال دماغ میں سما گیا کہ زندہ کسی طرح رہا جائے۔ لاشعور تک خالی ہو گیا اور ہم جانور بن کر رہ گئے۔

ہم دونوں نے ایک دوسرے سے بولنا ترک کر دیا

تھا تاکہ ہماری آواز کوئی نہ سُن لے۔ ہم نے اشارے مقرر کر لئے تھے۔ کچھ ہاتھوں سے، کچھ آنکھوں اور کچھ مُونہہ کھول کر۔ زبان ہلانے سے۔ یا ہم دو پتھر یا دو لکڑیاں ایک دوسری پر مار کر ایک دوسرے سے بات کرتے تھے پھر ہم نے جنگلی جانوروں کی بولی ازبر کر لی۔ اس خاموشی میں ایک مدت گزر گئی تو ایک روز معلوم ہوا کہ ہم اب بول ہی نہیں سکتے۔ انسان تصور میں باتیں کرتا رہتا ہے مگر ہمارے ذہن تصوروں سے بھی خالی ہو گئے تھے۔ نہ ہمیں سوتے میں کبھی خواب دکھائی دیتا تھا۔ ہماری صرف ایک حس زندہ تھی جو تھی سونگھنے کی حس ——————

ہم ایک سو گز دور سے بتا سکتے تھے کہ کوئی انسان آ رہا ہے یا جانور۔ اگر کوئی ایک سو گز دور سگریٹ پیتے تو ہم اس کی بھی بُو پا لیتے تھے۔

میرے پاس رائفل اور آٹھ کارتوس تھے۔ جن میں سے میں نے سات گولیوں سے جانور مارے تھے اور ایک مدت تک ان کا گوشت کچا ہی کھاتے رہے تھے۔ میں نے ایک گولی بچا کر رکھی ہوئی تھی۔ اب اگر میرے پاس گولیاں ہوتیں بھی تو میں فائر نہ کرتا کیونکہ گولی کا دھماکہ ہماری موجودگی کا انکشاف کر دیتا۔ اب ہم خالی ہاتھوں شکار کے اس قدر ماہر ہو گئے تھے کہ شکاری کتے کی طرح جانوروں کو دبوچ لیتے تھے۔ اس جنگل میں بارہ سنگھا مل جاتا تھا کوئی بارہ سنگھا چرتا چگتا نظر آ جائے تو میں اور مینا کاوا چھپتے رینگتے اس کے قریب پہنچ جاتے تھے اور بھیڑیے کی طرح جست لگا کر اسے سینگوں سے قابو کر لیتے تھے ایسے موقع پر خنجر بہت کام دیتا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے پاس خنجر موجود تھا گوشت کو بھوننے کے لیئے ہم آگ نہیں جلا سکتے تھے کیونکہ دھواں دور سے نظر آ جاتا ہے اس لئے ہم کچا گوشت کھا لیتے۔ ایک بارہ سنگھا کئی دنوں تک کافی ہوتا تھا۔

بارہ سنگھے کم ہو گئے تو ایک بار ہم ایک جنگلی سؤر کو پتھروں سے مارنے کے لئے کئی روز کوشش میں لگے رہے۔ یہ ایسا جانور ہے جسے ہاتھوں سے پکڑنا ناممکن تھا۔ آخر ہم نے اسے مار ہی لیا اور چند دن اچھے گزر گئے ہم پانی رات کے وقت ندی پر جا کر پیتے تھے۔ پھر ہم نے مینڈک اور چوہے کھانا شروع کر دیئے۔ درختوں سے جیسا کیسا پھل ملے۔ ہم کھا لیتے تھے۔ اب ہم انسان نہیں تھے۔ ہم جانوروں کی بولیاں بولتے تھے یا اشاروں سے باتیں کرتے تھے حقیقت یہ ہے کہ ہم بول ہی نہیں سکتے تھے۔ ہماری ڈاڑھیاں اور بال بڑھ آئے۔ کپڑے پھٹ کر جسم سے الگ ہو گئے۔ جسم پر مَیل کی تہیں جم گئیں اور ہم ان انسانوں کی طرح ہو گئے جو زمین پر پہلے انسان کہلایا کرتے تھے۔

ایک روز خیال آیا کہ جنگل میں بعض جگہوں پر امریکی اور جاپانی فوج کے راشن وغیرہ کے عارضی ذخیرے ہوا کرتے تھے۔ ہم نے راتوں کو چھپ چھپ کر وہ جگہیں تلاش کیں تو وہاں سے خالی ڈبے اور فوجی بوتلیں ملیں یا کچھ نمک مل گیا۔ مینا کاوا میرا اچھا دوست ثابت ہوا اگر وہ نہ ہوتا تو شاید میں بھی زندہ نہ رہتا اور اگر میں نہ ہوتا تو وہ مر جاتا۔

دس سال گزر گئے۔ انسانیت کی اگر کچھ رمق باقی

تھی تو وہ بھی نہ رہی۔ ہم بے زبان جانور تھے۔ ۱۹۴۶ء میں پھر ۱۹۵۳ء میں جنگل میں امریکی طیاروں سے اشتہار گرائے گئے جن پر لکھا تھا کہ اگر کوئی جاپانی جنگلوں میں چھپا ہوا ہے تو وہ باہر نکل آئے تاکہ اسے جاپان پہنچا دیا جائے کیونکہ جنگ بند ہو چکی ہے۔ یہ اشتہار جاپان کی نئی حکومت کی درخواست پر گرائے گئے تھے۔ حکومت کو بتایا گیا تھا کہ بے شمار جاپانی سپاہی ابھی تک مختلف جزیروں میں چھپے ہوئے ہیں۔ ہم نے اشتہار پڑھے تو اسے امریکی پروپیگنڈا سمجھا۔ ہم نے سوچا کہ یہ امریکیوں کی چال ہے۔ اور وہ جاپانیوں کو جال میں الجھا رہے ہیں۔ جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی۔ ہم تو جاپان کی فوج کا انتظار کر رہے تھے۔

۱۹۶۰ء کا ذکر ہے کہ ایک دفعہ مینا کاوا اکیلا ہی شکار کے لئے نکل گیا مگر واپس نہ آیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ کہاں گیا ہے۔ میں وہاں پہنچا تو وہ وہاں بھی نہ تھا اب میں بیک وقت صرف پانچ قدم چلتا تھا اور بیٹھ کر دو تقریباً تھا یا بارہ سنگھے کی آواز نکالتا تھا۔ لیکن مینا کاوا کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ میں جھاڑیوں میں گھومتا رہا اور ایک جگہ مجھے اس کے چپل مل گئے قریب ہی اس کا فوجی تھیلا پڑا تھا۔ میں اسے گھنے جنگل میں ڈھونڈنے لگا۔ رک رک کر بو سونگھی لیکن اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ خون کا بھی کوئی قطرہ نظر نہ آیا۔ یہی ایک ڈر تھا کہ اسے کسی جنگلی جانور یا درندے نے مار دیا ہے۔ اگر اسے گوام کے جنگلی باشندے پکڑ لیتے تو یقیناً مار دیتے۔ اس صورت میں اس کی لاش مل جاتی یا کہیں خون نظر آجاتا اس وقت خیال آیا کہ اسے امریکی پکڑ کر لے گئے ہیں۔ اب اسے تلاش کرنا بے سود تھا۔ میرا دل بجھ گیا۔ اس خیال نے بہت مایوس کیا کہ اب میں بھی پکڑا جاؤں گا۔ مینا کاوا نے یقیناً میری نشاندہی کر دی ہو گی۔ کئی دن اسی طرح گزر گئے آخر ایک صبح میں نے رائفل اٹھائی اور اس میں آخری گولی ڈالی اور بے دھڑک باہر نکل آیا۔ میں نے ارادہ کیا کہ امریکی مجھے بے بسی میں نہیں پکڑ سکیں گے۔ میں ان کا مقابلہ کروں گا۔ اور لڑتا ہوا مروں گا۔ میں جانتا تھا کہ امریکی کہاں ہیں۔ میں اسی طرف چل پڑا۔ اتنی طویل مدت میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں سینہ تان کر چل رہا تھا۔ اب مجھے چھپنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں امریکیوں سے لڑنے جا رہا تھا۔ میں نمایاں راستے پھلانگتا ایک چٹان پر چڑھ رہا تھا تو مجھے اوپر چار امریکی کھڑے نظر آئے۔ انہوں نے مجھے دیکھ لیا اور ایک امریکی میری طرف بڑھنے لگا۔ میں نے رائفل سیدھی کر لی۔ میں امریکیوں کے مقابلے میں آگیا تھا۔ میں نے اس مقابلے کے لئے سولہ برس انتظار کیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھے مار دیں گے لیکن میں ایک دو کو مار کر مرنا چاہتا تھا۔

جو امریکی میری طرف آرہا تھا۔ اسے میں نے غور سے دیکھا۔ وہ امریکی نہیں تھا۔ بلکہ امریکی وردی پہنے ہوئے میرا ساتھی مینا کاوا تھا اس کے سر کے بال کٹے ہوئے تھے اور داڑھی صاف تھی۔ چہرہ دھلا دھلایا اور چال میں ایک شان تھی۔ میں نے رائفل جھکا لی۔ میں اپنے ساتھی کو تو مارنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے غصہ ضرور آیا

کہ میرے ساتھی نے امریکی کپڑے پہن لئے تھے۔ یہ جاپان کی توہین تھی۔

وہ میرے سامنے آکر رکا اور کہنے لگا کہ اسے گوام کے جنگلیوں نے پکڑ کر امریکیوں کے حوالے کر دیا تھا میں حیران ہوا کہ وہ سولہ برسوں کی خاموشی کے بعد بول رہا تھا اسی نے مجھے قائل کر لیا کہ جنگ ختم ہوئے سولہ سال گزر گئے ہیں اور اب ہم آزاد جاپان میں واپس جا رہے ہیں۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ امریکیوں نے مجھے گھیر لیا اور ہنسنے لگے۔

میرے بال کاٹ دیئے گئے ان کی لمبائی دو فٹ تک پہنچ گئی تھی۔ میری داڑھی مونڈھ دی گئی اور مجھے گرم پانی سے نہلایا گیا۔ اسی وقت یاد آیا کہ مجھے نہائے سولہ سال بیت گئے ہیں۔ میرے جسم سے میل کی موٹی تہیں اتریں۔ بعض حصوں پر میل پتھر کی مانند ہو گئی تھی اسے بڑی مشکل سے اتارا گیا۔ پھر مجھے صاف ستھرے کپڑے دیئے گئے۔ اس کے باوجود مجھے یقین نہ آیا کہ یہ دوستی کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ جنگل کے سولہ برسوں نے میرے دل میں شکوک اور بے یقینی بھر رکھی تھی۔ میں نے سوچا کہ یہ لوگ مجھے نہلا دھلا کر قتل کر دیں گے اور یہ بھی یقین نہ تھا کہ جنگ ختم ہو چکا ہے۔ امریکیوں نے مجھے صاف ستھرا کھانا بھی کھلایا۔ پھر بھی میں انہیں شکی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ انہوں نے میرا ڈاکٹری معائنہ کیا جس کے لئے انہوں نے میرا خون بھی لیا۔ اسی وقت مجھے شبہ ہوا کہ یہ امریکی ظالم میرے جسم سے سارا خون نکال کر مجھے مار دیں گے۔ میں نے مینا کاوا کو الگ کر کے کہا کہ یہ لوگ اپنی رسم کے مطابق ہمیں قتل کر دیں گے۔ چلو بھاگ چلیں! وہاں سے بھاگنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ مینا کاوا نے جاپانی رسم کے مطابق دشمن کے ہاتھوں مرنے کی بجائے خودکشی کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اس واقعہ سے گھبرا کر امریکیوں نے ایک اور جاپانی کو بلایا۔ وہ ہم دونوں کی نسبت نہایت اچھی جاپانی زبان بولتا تھا۔ ہم دونوں اپنی مادری زبان کے بیشتر الفاظ بھول چکے تھے۔ اور ہم میں دلیل بازی یا دلیل فہمی کی صلاحیت ہی نہیں رہی تھی۔ اس جاپانی نے ہمیں گھنٹوں بٹھا بٹھا کر سمجھایا کہ ہمیں واقعی زندہ سلامت جاپان بھیجا جا رہا ہے لیکن ہم قائل نہ ہوئے۔ یہاں تک کہا گیا کہ وہاں سے جاپان ریڈیو ٹیلیفون کیا گیا۔ اُدھر سے میری بہن بول رہی تھی۔ ادھر ٹیلیفون مجھے دیا گیا لیکن اپنی سگی بہن سے بات کر کے میرے شکوک رفع نہ ہوئے۔ جب ہم دونوں کو ہوائی جہاز میں بٹھا کر جاپان بھیجا جانے لگا تو بحر الکاہل پر اڑتے ہوئے میں نے مینا کاوا سے کہا کہ ابھی یہ لوگ ہمیں سمندر میں پھینک دیں گے۔ ہم دونوں ڈرتے رہے۔ مینا کاوا نے کہا کہ اگر وہ ہمیں پھینکنے لگیں تو ہم لڑیں گے۔ آخر ہوائی جہاز جاپان کی سرزمین پر جا اترا۔ ہمیں باہر نکالا گیا اور جس نے سب سے پہلے میرا استقبال کیا وہ میری ماں تھی اس کے ساتھ میرے اور مینا کاوا کے عزیزوں رشتہ داروں کا ہجوم تھا۔ تب ہمیں یقین ہوا کہ جنگ واقعی ختم ہو گئی ہے ہم نے جاپان کو بالکل ہی بدلے ہوئے روپ میں پایا۔ مجھے میری قبر دکھائی گئی جس کے کتبے کے مطابق میں ۱۹۴۴ء میں مر چکا تھا۔ میں دوبارہ زندہ ہو گیا مگر جنگل کے سولہ برسوں نے مجھ میں جو عادتیں پیدا کر دی تھیں وہ بڑی ہی مشکل سے دور ہوئیں۔

••

گذشتہ ہنگاموں کی نذر ہونے کے بعد
خدا تعالیٰ کے فضل اور رحم کے ساتھ
ایک دفعہ پھر اوکاڑہ میں معیاری ہر قسم نیز سامان آرائش و زیبائش
و سامانِ ہوزری کا مرکز
ورائٹی سنٹر
ٹیلیفون نمبر: ۲۷۸۱
رہائش: ۲۷۸۰
ریلوے بازار
اوکاڑہ
جرسی
مفلر
اونی
سویٹر
چولہے
کراکری
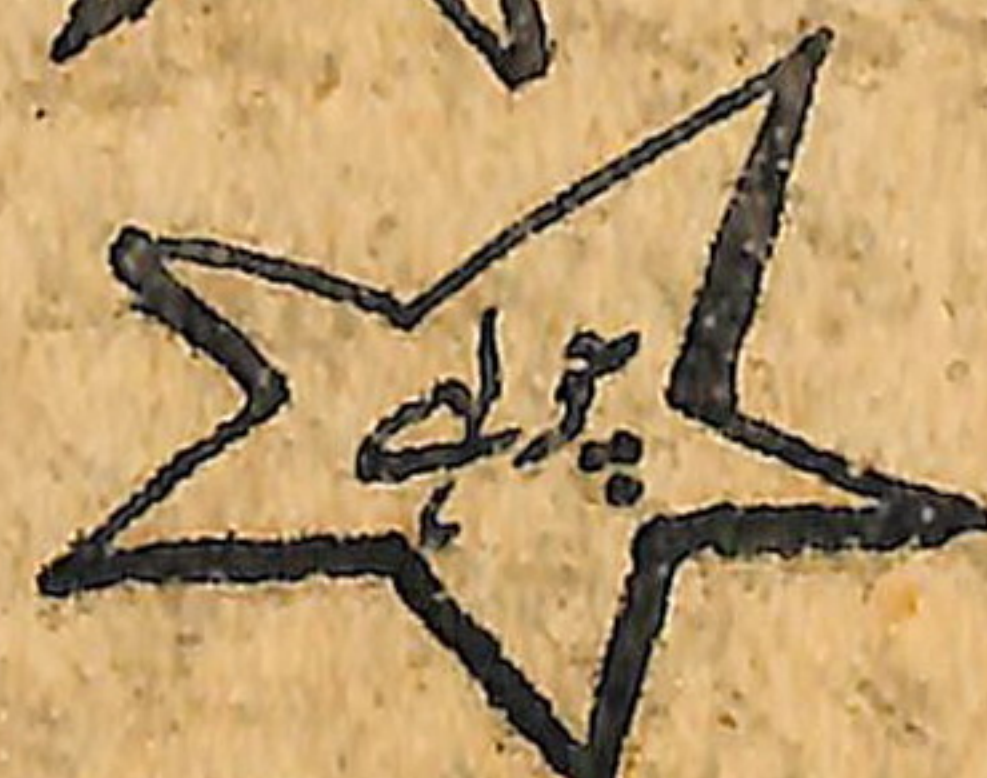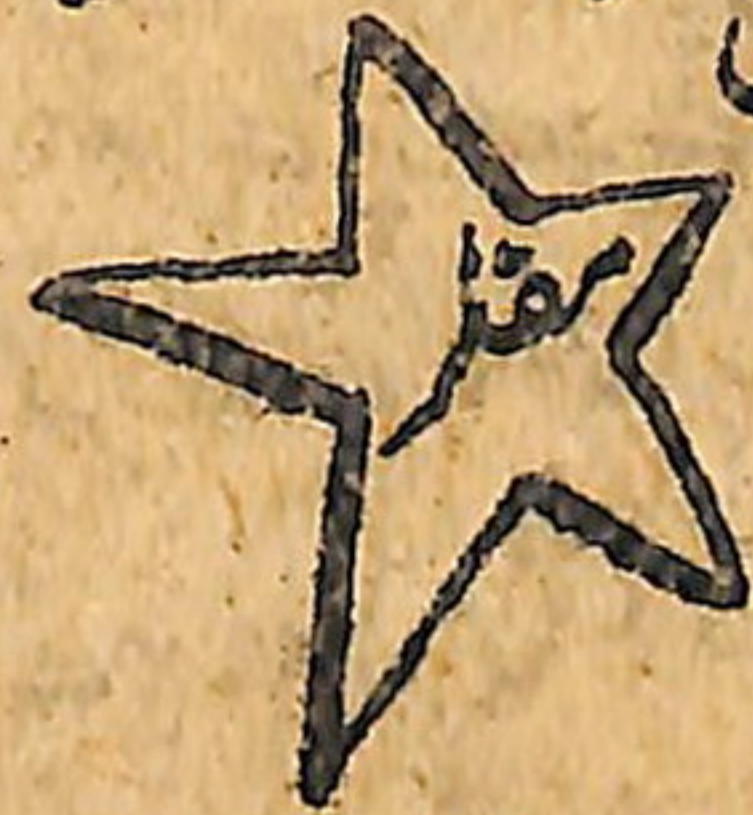
جناب مسعود احمد مسعود کوٹ احمدیہ ضلع بدین (سندھ)

برلن ایک قدیم شہر ہے مگر ساری دنیا میں رہنے والے ان بے شمار لوگوں کے لیئے جو اسے پسند کرتے ہیں یہ شہر سدا تر و تازہ رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برلن لوگوں کے لئے بڑا پُر کشش ہے اور وہاں ہر وقت آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ لوگ خوشی سے آتے ہیں پھر آنے کے لئے تشکر کے جذبات لئے چلے جاتے ہیں۔

جرمنی کا یہ قدیم دارالحکومت سیاحوں کی آماجگاہ بن چکا ہے کیونکہ یہ شہر گوناگوں رنگینیوں کا حامل ہے۔ چارلوٹن بورگ محلیں اب بھی بادشاہوں اور تاجداروں کی یاد دلاتا ہے اور اس بات کا دستاویزی ثبوت موجود ہے کہ برلن تیرھویں صدی کے اوائل میں بھی موجود تھا اگرچہ ظاہری شکل بدل چکی ہے اور اس کی ترجمانی گیتوں، نظموں، ناولوں، ڈراموں اور فلموں کے ذریعے کی گئی ہے۔ عظیم جذبے کے تحت تعمیر کیا گیا نیا برلن ماضی کو بھولنے کا خواہشمند نہیں ہے مگر اس کے ساتھ ہی بیتی کی تلخیوں کو یاد نہیں رکھنا چاہتا۔

یہ حقیقت ہے کہ اس کے باسی اس سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ برلن میں ہر سال بیس لاکھ سیاح آتے ہیں جو اس شہر کی از سرِ نو دل کشی کا ثبوت ہے۔ ہر سال یہاں پانچسو کانگریسیں اور اجلاس ہوتے ہیں۔ برلن کو صحیح معنوں میں کانگرسوں کا شہر کہا جا سکتا ہے اور یہاں سب سے بڑا کانگرس ہال ہے جو شہر کے وسط میں سرسبز "ٹیر گارٹن" کے کنارے واقع ہے اس میں تجارتی میلوں کے لئے بڑے بڑے ہال، اعلیٰ ہوٹل اور کانگرس سنٹر ہیں۔ یہ کانگرس ہال تین سال میں مکمل ہوگا اور یہ اپنی طرز کا منفرد مرکز ہوگا۔ اس سب سے بڑے ہال میں پانچ سو افراد کے بیٹھنے کی گنجائش ہوگی۔ یہ مرکز نمائشی علاقے میں تعمیر کیا جائے گا جہاں ہر سال تقریبات منعقد ہوتی ہیں۔ ان میں زراعت اور خوراک کا ہفتہ، فیشن کی نمائش، صنعتوں کی نمائش اور ریڈیو شو اہم حیثیت رکھتے ہیں۔

برلن سب سے بڑا جرمن شہر ہے جو ثقافتی اور سیاحوں کا مرکز بن چکا ہے بیس فیصد سیاح غیر جرمن ہوتے ہیں یہاں کی مستقل روایت ہے کہ مفاہمت میں رواداری برتی جائے۔ اسی لئے یہ شہر رواداری میں سب سے آگے ہے اور کبھی بھی کسی بات میں دوسرے شہروں سے پیچھے نہیں رہا جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے یہ ایک قدیم شہر ہے۔ مگر سست یا تھکا ہوا نہیں ہے اور نہ ہی اپنی سابقہ تاریخ کو نظر انداز کرتا ہے یہاں ہر ایک کی دلچسپی کا سامان موجود ہے کبھی بھی یہ بات

حیران کن ثابت ہوتی ہے۔ یہاں جھیلیں ہیں، دریا اور باغات ہیں، پھولوں کے میدان ہیں اور جنگل ہیں۔ یہ ایک سرسبز شہر ہے آپ مشکل سے یقین کریں گے مگر یہ حقیقت ہے کہ ایسے لوگ بھی ہیں جو چھٹیاں گزارنے برلن جاتے ہیں کیونکہ اس شہر میں دوسرے مقامات کی نسبت زیادہ آسائش ہے۔ دیوار کے ذریعے شہر کی تقسیم، جغرافیائی حیثیت بدلنے، اتحادی ماحول اور غیر فطری حالت کے باوجود برلن کو اپنا سابقہ اعلیٰ معیار حاصل کرنے سے کوئی نہیں روک سکا اور اس سلسلے میں ثقافت کا شعبہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ہربرٹ فون کارایان کی زیر قیادت جرمن فلہار مونک کا کوئی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ جہاں کئی آرکسٹرا اور میوزیکل تھیٹر ہیں جو فن میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ پیٹر شٹائن کی زیر نگرانی بڑے اچھے ڈرامے پیش کئے جاتے ہیں۔ یہ سب اس لئے کہ برلن میں نئے تجربات کرنے کی جرأت ہے اور قدیم روایات اور قدروں کو اپنائے رکھنے کے ساتھ ساتھ نئے خیالات کو سمونے کا ملکہ حاصل ہے۔ برلن کے ڈاہلن ضلع میں عجائب گھر اور قومی گیلری ہے یہ گیلری دیوار برلن کے نزدیک بنائی گئی ہے اور اس میں انیسویں صدی کے نوادرات بھی موجود ہیں۔ برلن میں انیسویں صدی کے آرٹ کے منفرد نمونے موجود ہیں اور اس صدی کے تعمیر کے فن کی چھاپ سارے شہر پر نظر آتی ہے اس لئے یورپ میں ثقافتی یادگاروں کی حفاظت کا جو سال منایا جا رہا ہے اس میں برلن کو خاص حیثیت حاصل ہے

برلن کے لوگ ماضی کو بھلانا نہیں چاہتے اور پورے خلوص سے اُسے یاد رکھنا چاہتے ہیں۔ ماضی کی بچی کھچی چیزوں کی پوری طرح حفاظت کی جا رہی ہے شہر برلن کی قدامت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کے شہری اپنے لئے نئی عمارتیں تعمیر نہ کریں کیونکہ شہر کے ارد گرد جنت ہی جنت ہے اور وہاں جدید فنِ تعمیر کی یادگاریں بھی موجود ہیں۔ برلن میں بے شمار بلند و بالا عمارتیں اور رہائشی علاقے جدید ترین ہیں۔ لیکن برلن کے رہنے والے ان پر تنقید کرتے ہیں کیونکہ ان کی وجہ سے وہ عجیب سا ماحول محسوس کرتے ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ لوگ اس بات کو نظر انداز کرتے چلے جا رہے ہیں درخت اور پودے لگائے جا رہے ہیں اور وہ انسانی ماحول بحال کر دیا گیا ہے جس کے بغیر برلن کے لوگ سانس نہیں لے سکتے تھے۔ کئی لوگ جو برلن جاتے ہیں وہاں مستقل طور پر قیام کر لیتے ہیں اور نوجوان تو اس کی مقناطیسی کشش کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس وقت شہر میں نوے ہزار غیر ملکی ہیں۔

برلن میں پرانے خاندان بہت کم ہیں۔ جرمن وقتاً فوقتاً دوسرے مقامات سے برلن آکر بس گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جرمن اس شہر میں آسانی سے کھپ جاتے ہیں اور صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنی پوری صلاحیت بروئے کار لاتے ہیں وہ ہر کام پوری ذمہ داری سے کرتے ہیں۔ برلن میں جانیوالے لوگوں کو اس تیزی اور گہما گہمی پر حیران نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ برلن کے رہنے والے بڑے حاضر دماغ اور پرخلوص ہیں اور ہر شخص بلا تامل اس حقیقت کی تصدیق کرتا ہے۔ : (ماخوذ از ... جرمنی)

جناب ایم مظفر احمد منصور متعلم ایم ایس سی آنرز (زراعت) لائلپور

ریبیز (Rabies) ایک مہلک اور خطرناک بیماری ہے۔ یہ ایک وائرس سے پھیلتی ہے۔ اسے کُتے کے کاٹے کی بیماری بھی کہتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ ایک وائرسی بیماری (Viral Disease) ہے جو کہ جانوروں سے پھیلتی ہے۔ ان میں کتّے۔ بلیاں گیدڑ، اور چمگادڑیں شامل ہیں۔ اس بیماری کے جراثیم ان جانوروں کے کاٹنے یا زخموں کو چاٹنے سے انسان کے جسم میں داخل ہو کر بیماری کا باعث بنتے ہیں۔ اس بیماری کی علامات۔ احتیاطیں اور حفاظتی تدابیر جاننا ہر ایک کے لئے مفید ہے۔

علامات : (SYMPTOMS)

اس بیماری کی علامات انسان کے جسم میں جراثیم کے داخل ہونے کے دس دن بعد یا زیادہ سے زیادہ اڑھائی ماہ بعد تک ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ شروع شروع میں کاٹنے کی جگہ پر درد ہوتا ہے اور ہلکا سا بخار ہوتا ہے۔ تھوڑے عرصہ بعد گلے میں رکاوٹ اور خراش پیدا ہو جاتی ہے۔ پٹھے کھنچ جاتے ہیں اور سانس لینا دشوار ہو جاتا ہے۔ طرح طرح کے خیالات خوفزدہ کرنے لگتے ہیں۔ مریض کی زیادتی سے سر درد کرنے لگتا ہے جسم ٹوٹنے لگتا ہے اور بار بار قے ہونے لگتی ہے۔ جسم میں کمزوری کی وجہ سے کھڑا ہونا مشکل ہو جاتا ہے جسم لڑکھڑانے لگتا ہے اور مریض ایک ہفتہ میں ہلاک ہو جاتا ہے۔

احتیاطیں : (CARES)

(۱) اس بیماری کو شروع میں ہی روکا جا سکتا ہے لیکن جب علامات ظاہر ہونے لگیں تو علاج مشکل ہو جاتا ہے اس لئے جونہی کتا کاٹنے کا واقعہ ہو فوراً علاج شروع کر دینا چاہیئے۔

(۲) زخموں کو فوراً صابن اور پانی سے دھو ڈالنا چاہیئے۔ اور جراثیم کش ادویات کا استعمال کرنا چاہیئے۔ کاٹی ہوئی جگہوں کو ٹانکنے سے پرہیز کیا جائے

(۳) یہ معلوم کرنے کے لئے کہ کاٹنے والا کتا باؤلا ہے یا پاگل ہے۔ یہ سوائے تجربہ گاہوں کے ممکن نہیں لیکن جہاں بیماری پھیلی ہوئی ہو۔ وہاں کتے کے کاٹنے کے فوراً بعد علاج شروع کر دینا چاہیئے اور

کتے کو دس دن تک باندھے رکھنا چاہیئے اگر کتا اسی عرصہ میں پاگل ہو جائے تو مکمل علاج کروانا چاہیئے اور اگر پاگل نہ ہو تو علاج بند کر دینا چاہیئے۔

حفاظتی تدابیر (PROTECTION MEASURES)

(۱) پالتو جانوروں کو ربیز (Rabies) کے حفاظتی ٹیکے لگوا دینے چاہئیں۔

(۲) بیماری سے جانوروں کو محفوظ کرنے کے لئے وبا کے پھیلنے سے قبل جانوروں کو ویکسینیشن (Vaccination) کروا دینا چاہیئے۔ ایک سی سی کے تین ٹیکے ایک ہفتہ کے وقفہ کے بعد لگوانے چاہئیں۔ چھ ماہ بعد ایک اضافی ٹیکہ بھی لگوانا چاہیئے۔ اس سے بیماری کی قوت مدافعت دو سال تک موجود رہتی ہے اگر اسی دوران کوئی نیا حادثہ پیش آجائے تو مزید ٹیکے لگوانے چاہئیں۔

(۳) آوارہ اور مشتبہ کتوں کو ختم کروا دینا چاہیئے ایسے کتے جن کے گلے میں رکاوٹ ہو۔ اُن سے احتیاط کرنی چاہیئے کیونکہ یہ ربیز (Rabies) کی ابتدائی علامات میں سے ایک ہے۔

(۴) باؤلے کتے کے کاٹے جانے والے مریضوں کو فوری طور پر سیرم (Serum) کے انجکشن دینے چاہئیں۔ جن سے وقتی طور پر بیماری میں مدافعت کی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔۔۔

○

غزل

جناب عارف حیات عرفی (ربوہ)

تیری راہوں میں کبھی رکتا کبھی گاتا ہوں میں
ان کھلونوں سے بس اپنے جی کو بہلاتا ہوں میں

تجھ سے ملنے کی لگن دل میں چھپائے آج بھی
ایک انجانے سے رستے پر چلا جاتا ہوں میں

جب کبھی گلشن میں آتی ہے بہارِ زندگی
ہر کلی ہر گل کے سینے میں تجھے پاتا ہوں میں

کھینچتا تھا ظلم کی تصویر لفظوں میں کبھی
اب تری تصویر دنیا بھر کو دکھلاتا ہوں میں

خوشنما پیکر کہاں ؟ وہ جادہ و منزل کہاں ؟
اب تو عرفی اپنے ہی سائے سے ٹکراتا ہوں میں

○

شوخ تحریریں

بچے

بچوں سے کبھی کبھی نرمی سے بھی پیش آنا چاہیئے۔

بچے سوال پوچھیں تو جواب دیجئے۔ مگر اسی انداز میں کہ دوبارہ سوال نہ کر سکیں۔ اگر زیادہ تنگ کریں تو کہہ دیجئے! جب بڑے ہوگے سب پتہ چل جائے گا۔ بچوں کو دلچسپ کتابیں مت پڑھنے دیجئے۔ کورس کی کتابیں کافی ہیں۔ بچوں کو بھوتوں سے ڈراتے رہیئے شاید وہ بزرگوں کا ادب کرنے لگیں۔ اگر بچے بیوقوف ہیں تو پرواہ نہ کیجئے۔ بڑے ہو کر جینیئس بنیں گے۔ یا اپنے آپ کو جینیئس سمجھنے لگیں گے بچے کو سب کے سامنے مت ڈانٹیے۔ اس کے تحت الشعور پر بُرا اثر پڑے گا۔ ایک طرف لے جا کر اس کی خوب تواضع کیجئے۔

اگر بچے ضد کرتے ہیں تو آپ بھی ضد کرنی شروع کر دیجئے وہ شرمندہ ہو جائیں گے۔ دیکھا گیا ہے کہ کنبے میں دو تین بچے ہوں تو وہ لاڈلے بنا دیئے جاتے ہیں۔ لہٰذا بچے ہمیشہ دس بارہ ہونے چاہئیں تاکہ ایک بھی لاڈلا نہ بن سکے۔

اسی طرح آخری بچہ سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے بگڑ جاتا ہے چنانچہ آخری بچہ نہیں ہونا چاہیئے۔

(شفیق الرحمان)

(مرسلہ: طارق احمد بٹ۔ کراچی)

پبلشر ... پرنٹر ... مطبع: ضیاء الاسلام پریس ربوہ مقام اشاعت: دفتر ماہنامہ خالد دارالصدر جنوبی ربوہ

Monthly **KHALID** Rabwah

Tabligh 1355 H. S.—February 1976 Regd. No. L5830

Editor : NASIM MAHDI

"شعبہ تحریک جدید" کے تحت منعقدہ عالمگیر زبانوں کے جلسہ کے دو مناظر

حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد کی صدارت میں یہ جلسہ 26 دسمبر 1975 کو رات ½7 بجے مسجد اقصیٰ میں منعقد ہوا۔ حضرت صاحبزادہ صاحب کے دائیں جانب مکرم مبارک احمد صاحب طاہر مہتمم تحریک جدید تشریف فرما ہیں۔

(تفصیلی رپورٹ اندر کے صفحات میں ملاحظہ فرمائیں)

(1)
مکرم جناب الحاج محمد کمانڈا ہونگے
(سیرالیون)

(2)
مکرم جناب سکری برماوی
(انڈونیشیا)

Title printed at the Nusrat Art Press, Rabwah.